پاکستان انسانی حقوق رپورٹ ۲۰۱۷ء

ایگزیکٹو سمری

پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہے۔ مئی ۲۰۱۳ء میں پاکستان مسلم لیگ۔ نواز (پی ایم ایل۔ این) جماعت نے پارلیمانی انتخابات میں اکثریت سے نشستیں حاصل کیں اور نواز شریف تیسری بار وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اگرچہ انتخابات کافی حد تک آزاد اور منصفانہ تھے بعض غیر جانبدار مبصرین اور سیاسی جماعتوں نے انتخابی بے ظابطگیوں پر تشویش کا اظہار کیا۔ ۲۸ جولائی کو سپریم کورٹ نے [نواز] شریف کو کرپشن کے الزامات پر نااہل قرار دے دیا۔ پارلیمان نے یکم اگست کو شاہد خاقان عباسی کو نیا وزیر اعظم منتخب کیا۔ آصف علی زرداری نے ستمبر ۲۰۱۳ء میں پانچ سالہ صدارتی مدت پوری کی اور ممنون حسین (پی ایم ایل۔ این) نے ان کے بعد کرسئ صدارت سنبھالی۔ فوج (چیف آف آرمی اسٹاف) اور عدلیہ (چیف جسٹس سپریم کورٹ) کی پُرامن تبدیلی نے جمہوری انتقالِ اختیار کی روایت کو مضبوط کیا۔

سویلین حکام نے عمومی طور پر سلامتی کے اداروں پر مؤثر اختیار برقرار رکھا۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے سب سے نمایاں مسائل میں ماورائے عدالت اور چُن چُن کر قتل کرنا (ٹارگٹ کلنگ)، گمشدگیاں، تشدد، قانون کی بالادستی کا فقدان، بشمول جائز کارروائی کا حق نہ ملنا، قانون کا غیر مؤثر نفاذ اور اس ہر عملدرآمد نہ ہونا، پُرہجوم افراد کے تشدد کے مسلسل واقعات اور محدود احتساب کے ساتھ خود ساختہ انصاف شامل تھے۔ دیگر مسائل میں جبری قید، عدالتی کارروائی سے قبل لمبی مدت تک قید، ماتحت عدالتوں میں عدالتی آزادی کا فقدان، حکومت کے جانب سے شہریوں کے چادر اور چاردیواری کے حقوق کا انحراف، صحافیوں کو خوف زدہ کرنے اور اُن پر اور صحافتی تنظیموں پر بڑے حملے شامل تھے۔ اجتماع کے حق، نقل و حرکت کے حق اور مذہبی آزادی کے حق کو محدود کرنے کی سرکاری کوششیں، مذہبی اقلیتوں سے امتیازی سلوک اور فرقہ وارانہ تشدد جاری رہا۔ حکومت اور پولیس میں بدعنوانی، عصمت دری سے متعلقہ مقدمات میں مجرمانہ تفتیش اور احتساب کا فقدان، صنفی بنیادوں، صنفی شناخت اور جنسی رجحان کی بنیاد پر تشدد اور خوف و ہراساں کرنے، نام نہاد غیرت کے نام پر پر جرائم اور لڑکیوں کے ختنے کے مسائل بھی برقرار رہے۔ باہمی رضامندی کے باوجود ہم جنسی تعلقات ایک جرم ہے، لیکن حکومت نے شاذونادر ہی کسی مقدمہ کی سماعت کی۔ تشدد اور انسانی اسمگلنگ کے خطرات لاحق ہونے کے باوجود بچوں سے جبری مشقت، بشمول جبری اور گروی رکھ کر مزدوری کے واقعات جاری رہے۔

حکام کے خلاف احتساب کی کمی تھی بدسلوکی کے واقعات اکثر بنا سزا جزا کے چلتے رہے، جس سے جرائم کے مرتکب افراد، سرکاری ہو یا غیر سرکاری، کے لیے کھلی چھوٹ (استثنیٰ) ہونے کی روایتیں مضبوط ہوتی رہیں۔ اعلیٰ حکام نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث سرکاری اہلکاروں کو کبھی کبھار ہی سزا دی۔

غیر ریاستی عناصر کی جانب سے دہشتگردانہ تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں نے ملک میں انسانی حقوق کے مسائل میں اضافہ کیا۔ فوج نے عسکریت پسندوں اور دہشتگرد گروہوں کے خلاف قابل ذکر مہم جوئی جاری رکھی۔ اس کے علاوہ مقامی اور غیر ملکی غیر ریاستی عناصر اور عسکریت پسند تنظیموں کی جانب سے تشدد، زیادتی، سماجی اور مذہبی عدم برداشت نے ملک کے کچھ حصوں میں، خاص طور پر بلوچستان، سندھ، خیبر پختونخوا اور وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات، لاقانونیت کی روایت کو فروغ دیا۔ ساؤتھ ایشیا ٹیررزم پورٹل (سیٹپ) کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۶ء کے پورے سال کے ۸۰۳، ادہشت گرد ہلاکتوں کے مقابلے میں گزشتہ سال صرف اکتوبر کے اختتام تک دہشتگردی کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد ۱،۰۸۴ تھی۔ سیٹپ عوامی مفادات کی وکالت کرنے والے انسٹیٹیوٹ فار کنفلکٹ مینجمنٹ کا ڈیٹا بیس (معلوماتی ذخیرہ) ہے جو جنوبی ایشیا میں ہونے والے دہشتگردی اور چھوٹے پیمانے کی جنگ کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرتا ہے۔

حصہ اول۔ انسان کی خود مختاری کا احترام، بشمول مندرجہ ذیل باتوں سے آزادی:

(الف)۔ زندہ رہنے کے حق سے جبری طور پر محروم کرنا اور دیگر غیر قانونی یا سیاسی محرکات کی بنیاد پر قتل عام

ایسی بے شمار اطلاعات تھیں کہ حکام نے اندھا دھند یا غیر قانونی قتل کیے۔ سیکیورٹی فورسز نے مبینہ طور پر پنجاب، بلوچستان، فاٹا، سندھ اور خیبر پختونخوا میں جاری تنازعات سے متعلقہ ماورائے عدالت قتل کیے (ملاحظہ فرمایئے حصہ اول۔ ز۔)

سرکاری تحویل کے دوران جسمانی تشدد مبینہ طور پر کچھ ملزمان کے موت کا سبب بنا۔ عدالتی چارہ جوئی میں تاخیر اور قتل کے ذمہ دار افراد کے خلاف نظم وضبط کی کارروائی اور تعزیری اقدامات نہ کرنے کے عمل نے چھوٹ حاصل ہونے کی روایت کو مستحکم کیا۔

۲۷ جون کو، پاراچنار، کرم ایجنسی، میں فرنٹیئر کور نے ایک ہجوم پر فائرنگ کر دی، جس سے چار افراد ہلاک ہو گئے۔ یہ گروہ پاراچنار کو دہشتگردی سے بچانے میں حکام کی بظاہر ناکامی کے خلاف دھرنا دے رہا تھا۔ واقعہ کے بعد چیف آف آرمی اسٹاف (فوج کے اعلیٰ ترین اہلکار) جنرل قمر جاوید باجوہ نے ذاتی طور پر پاراچنار کا دورہ کیا اور پاراچنار فرنٹیئر کور کے کمانڈنٹ کو ہٹانے اور واقعہ کی تحقیقات کا حکم دیا۔

بلوچستان اور سندھ میں مبینہ طور پر سیاسی محرکات کی بنیادوں پر ہلاکتوں کے مسلسل الزامات لگتے رہے۔ ۶ جولائی کو نامعلوم مسلح افراد نے بلوچستان نیشنل پارٹی کے رہنما ملک نوید دیھوار اور ان کے محافظ محمد ظریف کو قتل کر دیا۔ ۲۷ اپریل کو، مقامی حکام کو بلوچ نیشنل موومنٹ کے رہنما بیت اللہ محمود بلوچ سمیت پانچ مغوی بلوچ کارکنوں کی مسخ شدہ نعشیں ملیں۔ اس واقعہ کے مرتکب افراد نامعلوم رہے۔

سیٹپ نے رپورٹ کیا کہ بلوچستان میں صحافی، اساتذہ، طالبعلم اور انسانی حقوق کے کارکن بھی ریاستی اور اور غیر ریاستی عناصر کا نشانہ بنتے رہے۔ سیٹپ کے مطابق بلوچستان میں دہشتگردی کے واقعات کے باعث ۲۰۱۶ء کے ۲۵۱ کی نسبت کم از کم ۱۸۳ شہری ہلاک ہوئے۔

سندھ میں سیاسی گروہوں یا نامعلوم حملہ آوروں کی جانب سے سیاسی محرکات کی بنیاد پر قتل عام کی اطلاعات موجود تھیں۔ جولائی میں نامعلوم عسکریت پسندوں نے پاک سرزمین پارٹی (پی ایس پی) کے دو سرگرم کارکنوں۔ عبدالحمید (عرف ملا) اور راشد خان کو کراچی میں قتل کر دیا۔ پی ایس پی کے چیئرمین نے متحدہ لندن دھڑے پر ان کے قتل کا الزام لگایا۔

سندھ، بلوچستان، خیبر پختونخوا اور پنجاب میں صوبائی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں عسکریت پسندوں اور دیگر غیر ریاستی عناصر کے حملوں کا حدف رہیں۔

فروری میں اپنے قیام کے اعلان کے بعد، انصارالشریعہ پاکستان (اے ایس پی، جماعت انصارالاسلام الاشریعہ پاکستان کے نام سے بھی معروف ہے) مبینہ طور پر کم از کم سات حملوں میں ملوث تھی، جن میں سندھ میں ایک ریٹائرڈ کرنل، چھ پولیس اہلکار اور ایک نجی محافظ قتل ہوئے جبکہ بلوچستان میں سیکورٹی فورسز کو نشانہ بنایا۔ ۱۲ اگست کو، اے ایس پی نے کراچی میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ٹریفک) حنیف خان (عمر ۵۶ سال) اور ان کے ڈرائیور کانسٹیبل سلطان اشتیاق کو قتل کیا۔ اے ایس پی کے ترجمان عبداللہ ہاشمی نے کہا کہ یہ حملہ جیل میں قید عسکریت پسندوں پر مبینہ طور پر ہونے والے تشدد کا "بدلہ" تھا۔ سندھ پولیس کے شعبہ انسداد دہشت گردی (سی ٹی ڈی) نے اس مقدمہ کی تحقیقات جاری رکھی، تاہم کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ حکام نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اے ایس پی سندھ اسمبلی کے قائدِ حزب اختلاف خواجہ اظہار الحسن پر قاتلانہ حملے میں بھی ملوث تھی۔

پولیس پر حملوں کی بھی متعدد اطلاعات موجود تھیں۔ ۲۳ جون کو کوئٹہ میں انسپکٹر جنرل پولیس کے دفتر کے قریب ایک دھماکے میں کم از کم گیارہ افراد ہلاک ہوئے، جن میں سات پولیس اہلکار شامل تھے۔ پنجاب کے صوبائی حکام کے مطابق پولیس فورس لاہور میں ۲۴ جولائی کو ہونے والے اس خودکش حملے کا بنیادی ہدف تھی، جس میں ۹ پولیس اہلکاروں سمیت ۲۶ لوگ جاں بحق ہوئے۔

عسکریت پسندوں اور دہشتگرد گروہوں نے بموں، خودکش حملوں اور دیگر تشدد کے ذرائع سے سینکڑوں افراد کو ہلاک اور زخمی کیا (ملاحظہ کیجئے حصہ اول۔ ز۔)۔

(ب)۔گمشدگی

ملک کے لگ بھگ تمام علاقوں میں مختلف پس منظر کے حامل افراد کے اغوااور جبری گمشدگی کے واقعات رونماہوئے۔ بعض کو پولیس اور سیکیورٹی فورسز نے مبینہ طور پر قید تنہائی میں رکھااور ان کے مقام موجودگی کو ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔

جنوری میں پانچ سوشل میڈیابلاگرز غائب ہوئے، جس پر حکومت کے خلاف بڑی چیخ وپکار ہوئی، کیونکہ اُس ہی کو اغواکا ذمہ دار سمجھا جارہا تھا۔ کافی ہفتے کے بعد، پانچ میں سے چار بلاگرز ظاہر ہوئے، ثمر عباس دسمبر کے مہینے تک گم تھا۔ اکتوبر میں، واپس آنے والے چار بلاگرز میں سے ایک نے سرعام دعویٰ کیا کہ ان کو ایک ریاستی خفیہ ادارے نے دوران گمشدگی تشدد کا نشانہ بنایا۔

ذرائع ابلاغ نے نشر کیا کہ دسمبر ۲ کو، رضاخان لاہور میں ایک چھوٹے عوامی پروگرام کا شریک میزبان بننے کے بعد لاپتاہوا، جس میں حکومت کی جانب سے اسلام آباد میں ایک ہفتہ تک احتجاج کرنے والے شدت پسند مذہبی گروہ کے مطالبات منظور کرنے جیسے معاملات زیرِ بحث آئے۔ پریس رپورٹوں کے مطابق اُس پروگرام میں شرکت کرنے والے اُن کے ایک دوست نے بتایا کہ مذکورہ پروگرام میں توہین رسالت کے قانون کے غلط استعمال کا معاملہ بھی اٹھایا گیا تھا۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق رضاخان کے بھائی نے پولیس میں گمشدگی کی اطلاع کی تھی۔

کراچی سے تعلق رکھنے والی سیاسی تنظیم متحدہ قومی موومینٹ (ایم کیوایم) نے نیم فوجی سندھ رینجرز پر کراچی آپریشن کے دوران اس کے کچھ کارکنان کے اغوا، ان پر تشدد اور قتل کا الزام لگایا۔ ایم کیوایم نے دعویٰ کیا کہ جولائی میں اس نوعیت کے ۲۱ واقعات رونماہوئے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے بہت سارے سندھی اور بلوچ قوم پرست گم ہونے کی خبر دی۔ سندھ میں قوم پرست تنظیموں نے بھی الزام عائد کیا کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے سندھی سیاسی کارکنوں کو اغواکر کے قتل کیا۔

معروف قوم پرست تنظیموں جیئے سندھ قومی محاذ اور جیئے سندھ متحدہ محاذ (جسمم) کے اہم رہنمامبینہ طور پر لاپتہ ہوگئے۔ سندھی قوم پرست اور سیاسی کارکن ڈوڈوچانڈیو ۱۱ جولائی کو اپنے ساتھی مہران چانڈیو، آصف بلیدی، ندیم کولاچی اور سیف جتوئی کے ہمراہ گم ہوا۔ ۵ اگست کو خود ساختہ جلاوطن علیحدگی پسند جسمم رہنما شفیع برفت کے خاندان کے لوگوں کو انکی رہائش سے اٹھایا گیا۔ جسمم قمبر شہداد کوٹ کے صدر، پارٹی رکن اعجاز تنیو، مرکزی

کمیٹی کے رکن صابر چانڈیو اور پارٹی کے حمایتی مرتضیٰ جونیجو، ہدایت لوہار، خادم حسین آریجو اور محمد ایوب کاندھڑو بھی صوبہ سندھ سے لاپتہ ہوئے۔ غیر رضاکارانہ طور پر لاپتا ہونے والے افراد کی واپسی کے لیے جدوجہد کرنے والے آٹھ افراد خود جبری طور پر لاپتہ کیے گئے، جن میں عباس لُنڈ، صحافی غلام رسول برفت، مصنف انعام اللہ عباسی، رضا جروار، پرتاب شوانی، نصیر کنبھر، پنھل ساریو اور شعیب کوریجو شامل تھے۔ آخری چار مذکورہ افراد واپس آ گئے جبکہ باقی افراد کا کوئی پتہ نہیں مل سکا۔

۱۲ جون کو پولیس اور سیکیورٹی ایجنسیوں نے بلوچستان میں جبری گمشدگیوں کے متاثرین کے حقوق کے لیے سرگرم گروپ انٹرنیشنل وائیس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے چیئرمین نصر اللہ بلوچ کو تین ساتھیوں کے ہمراہ مبینہ طور پر اغوا کیا۔

سپریم کورٹ کے جسٹس جاوید اقبال اور قانون نافذ کرنے والے اہلکار محمد شریف کی سربراہی میں قائم لاپتہ افراد کے بارے میں بنائے گئے "دی کمیشن آف انکوائری آن اِنفورسڈ ڈِس اپیئرنسز" کو ۲۰۱۱ء تا ۳۰ دسمبر ۶۰۸، ۴ لاپتہ افراد کے مقدمات موصول ہوئے۔ کمیشن نے ۳،۰۷۶ شہریوں کی بازیابی کا دعویٰ کیا جبکہ ۵۳۲، ۱ مقدمات حل نہیں ہوئے۔ حالانکہ ذرائع ابلاغ اور عالمی اداروں کی توجہ زیادہ تر بلوچستان اور سندھ پر رہی لیکن کمیشن کی طرف سے جاری کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق جولائی تک گمشدہ لوگوں کی سب سے بڑی تعداد خیبر پختونخوا کی (۷۵۱ لاپتہ) ہے۔ دوسرے علاقوں میں پنجاب (۲۴۵ لاپتہ)، بلوچستان (۹۸ لاپتہ) سندھ (۵۰ لاپتہ)، فاٹا (۴۸ لاپتہ)، اسلام آباد دارالحکومت (۴۵ لاپتہ)، آزاد جموں و کشمیر (۱۴ لاپتہ) اور گلگت بلتستان (۵ لاپتہ) ہیں۔

(ج)۔ تشدد اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی اور تذلیل بھرا برتاؤ یا سزا

اگرچہ آئین تشدد اور دیگر ظالمانہ، غیر انسانی اور تذلیل آمیز برتاؤ کی ممانعت کرتا ہے، لیکن ضابطہ فوجداری میں تشدد کے خلاف کوئی خصوصی دفعہ نہیں ہے۔ کوئی قانونی شق واضح طور پر تشدد سے نہیں روکتی۔ ایسی اطلاعات آئیں کہ سیکیورٹی فورسز، بشمول خفیہ ایجنسیوں نے زیرِ حراست افراد پر تشدد کیا اور ان سے بدسلوکی کی۔

ایشین ہیومن رائیٹس کمیشن کے مطابق، مناسب شکایت مراکز کی عدم دستیابی اور فوجداری قانون میں تشدد کی تعریف اور انسداد کی مخصوص شق کی غیر موجودگی ایسے عمل میں اضافہ کا سبب بنی۔ کمیشن نے کہا کہ حکومت نے تشدد کو جرم قرار دینے کے لیے کوئی بھی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور یہ کہ اس کے مرتکب افراد، اکثر پولیس یا فوج کے اہلکار، بلاروک ٹوک کام کرتے رہے۔

ایسی اطلاعات بھی تھیں کہ پولیس نے ظالمانہ اور ہتک آمیز برتاؤ کیا اور سزا دی۔ ہیومن رائیٹس کمیشن آف پاکستان نے رپورٹ کیا کہ پولیس نے دسمبر تک لگ بھگ ۱۱۴ مقدمات میں "حدود سے تجاوز" کیا، ۲۰۱۶ء میں اس نوعیت کے ۱۴۷ واقعات ہوئے۔ بہت سے ذرائع نے اطلاعات دیں کہ تشدد بعض اوقات اموات اور گہرے زخم کی وجہ بنا لیکن اکثر کم ہی کوئی شکایت درج ہوئی۔

گیارہ اکتوبر کے ڈان اخبار کی خبر کے مطابق، باہو چوک تھانے سے تعلق رکھنے والی پنجاب پولیس نے جھبراں منڈی کے علاقے میں آٹھویں کلاس کے طالبعلم ارسلان مشتاق کو تشدد کر کے مار دیا۔ پولیس نے مبینہ طور پر لڑکے کے سر پر پستول مارا، وین میں ڈال کر لے گئی اور بعد میں اس کی لاش سڑک کے کنارے پھینک دی۔

وفاق اور صوبائی زیرِ انتظام علاقوں (فاٹا اور پاٹا) میں نافذ قانون فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز (ایف سی آر) ۱۹۰۱ کے تحت اجتماعی سزا پر عملدرآمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۰۱۱ء میں حکومت نے ایف سی آر میں ترمیم کر کے خواتین، ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے افراد اور سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کو اجتماعی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ حکام اجتماعی سزا کا استعمال بتدریج طریقہ کار سے کرتے ہیں یعنی خاندان کے قریبی موجود مرد سے شروع کر کے پھر ذیلی قبیلے اور پھر باہر تک سزا کا دائرہ بڑھا دیا جاتا ہے، اگرچہ یہ بتدریج طریقہ کار قانون کے اطلاق کی گنجائش کم کر دیتا ہے۔ ایف سی آر انفرادی حقوق کی پرواہ کیے بغیر اجتماعی سزا تفویض کرتا ہے۔ انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) نے اجتماعی ذمہ داری کے تصور کے پر تشویش ظاہر کی کیونکہ حکام کسی ایک مفرور کو پکڑنے کی خاطر اس قبائلی روایات کا استعمال کرتے ہوئے ملزم کے پورے قبیلے کے ارکان کو گرفتار، انکے گھروں کو مسمار، جائداد ضبط یا تباہ، اور گاؤں کا گھیراؤ کرتے ہیں جب تک مفرور حوالے نہ کر دیا جائے یا اس کا اپنا قبیلہ مقامی رواج کے مطابق اس کو سزا نہ دے۔ نومبر ۲۰۱۶ء سے جون تک، مہمند ایجنسی کی سیاسی انتظامیہ نے عسکریت پسندوں کی مبینہ طور پر حمایت کرنے کی وجہ سے صافی قبیلے کی زیارت سنگ مرمر کان میں تمام کان کنی کی سرگرمی معطل کر دی تھی۔ جولائی میں خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے سیکورٹی فورسز پر حملے کے بعد "سپاہ" قبیلے کو معاوضے کی ادائیگی معطل کر دی۔ جنوبی وزیرستان ایجنسی کی پولیٹیکل انتظامیہ نے ایجنسی ہیڈ کوارٹرز اسپتال میں آگ کے ایک واقعہ کے بعد ڈاکٹروں، اساتذہ اور طالبعلموں سمیت ۹۷ افراد کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اس واقعہ میں دو ایمبولنس، ایک میڈیکل اسٹور اور نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی کے دفتر جل گئے تھے۔ مقامی سیاسی جماعتوں اور طلبہ تنظیموں کے احتجاج اور مظاہروں کے باوجود گرفتار افراد پولیس کی تحویل میں رہے۔

اگست تک ملک کے ۷،۰۰۹ پولیس، عسکری ماہرین اور فوجی دنیا بھر میں امن قائم رکھنے والے مشن میں فرائض انجام دے رہے تھے۔ اقوام متحدہ نے رپورٹ کیا کہ ۱۵ اکتوبر تک اس کو پاکستان کے امن دستوں کے خلاف جنسی استحصال اور جنسی زیادتی کے دو الزامات موصول ہوئے، ایک واقعہ مبینہ طور پر ستمبر ۲۰۱۶ء میں رونما ہوا ہے اور دوسرا مبینہ طور پر جنسی استحصال اور جسمانی تعلقات برقرار رکھنے کا واقعہ ۲۰۱۱ء (تاریخ نامعلوم) سے جون ۲۰۱۲ء کے درمیان جاری رہا۔ ایک زیرِ التوا الزام ۲۰۱۶ء کا ہے، جس میں مبینہ طور پر کوٹ ڈی آئیور میں اقوام متحدہ کے آپریشن میں تعینات فوجی اہلکاروں کے جانب سے ایک کمسن کی عصمت دری میں ملوث ہونے کا معاملہ ۱۵ اکتوبر تک حکومت پاکستان اور اقوام متحدہ دونوں کی زیر تفتیش تھا۔

جیل اور حراستی مراکز کے حالات

کچھ جیلوں اور حراستی مراکز کے حالات سنگین اور جان لیوا تھے۔ گنجائش سے زیادہ بھیڑ اور صحت کی دیکھ بھال کی غیر مناسب سہولیات جیسے مسائل عام تھے۔

طبعی حالات: جیل کے حالات اکثر طور پر انتہائی خراب تھے۔ گنجائش سے زیادہ ہجوم کا مسئلہ عام تھا۔ سوسائٹی فار ہیومن رائٹس اینڈ پرزنرز ایڈ پاکستان (شارپ) کے اندازے کے مطابق ملک بھر کی جیلوں میں کُل قیدیوں کی تعداد ۹۵،۰۰۰ سے ۱۰۷،۰۰۰ کے درمیان تھی جبکہ، دعویٰ کے مطابق ، جیلوں کی اصل گنجائش ۳۶،۰۰۰ قیدیوں کو رکھنے کی ہے۔ انسپکٹر جنرل کے دفتر نے بتایا کہ جیلوں کی گنجائش ۵۲،۷۸۴ افراد کی ہے۔

جیلوں اور حراستی مراکز کی دیکھ بھال کی بنیادی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر تھی۔

اگرچہ جیل کے اندر کھانے کے مقدار و معیار میں بہتری آئی، لیکن ناکافی کھانے اور طبی سہولیات کی عدم دستیابی اُن قیدیوں میں صحت کے دائمی مسائل اور خوراک کی کمی کا سبب بنتی رہی، جو خاندان اور دوستوں کی مدد سے خوراک کی ضروریات کو مکمل کرنے سے قاصر تھے۔ بہت سے مراکز میں صفائی، ہوا خوری، روشنی اور صاف پانی تک رسائی کی سہولیات ناکافی تھیں۔ اکثر جیل پرانے اور بوسیدہ عمارتوں میں تھے جہاں اندرونی درجہ حرارت پر کنٹرول کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔ صحت کی بنیادی اور ہنگامی دیکھ بھال کا نظام تو موجود تھا مگر نوکر شاہی کے قواعد وضوابط کی وجہ سے اس تک رسائی سست روی کا شکار تھی۔ غیر ملکی قیدی مُدتِ قید پوری کرنے کے باوجود لمبے عرصے سے پابند سلاسل تھے کیونکہ وہ اپنے آبائی وطن کی طرف ملک بدری کے لیے خرچہ ادا کرنے سے قاصر تھے۔ جنوری سے مئی تک، ۱۶ قیدیوں کی کراچی سینٹرل جیل اور ملیر جیل میں موت واقع ہوئی۔ جیل کے میڈیکل ریکارڈ میں اکثر کی وجہ موت "حرکت قلب بند ہونا" لکھا ہوا تھا۔ پریس کی رپورٹوں اور جیل اسپتال کے ذرائع کے مطابق، ادویات کی کمی کے ساتھ ساتھ جیل کے اندر صحت کے مراکز کی حالت بدتر تھی۔

جیلوں کی حفاظت بھی باعث تشویش رہی۔ ۱۴ جون کو، کالعدم لشکرِ جھنگوی دہشتگرد گروہ کے دو ارکان شیخ محمد ممتاز اور محمد احمد خان کراچی سینٹرل جیل سے فرار ہوئے، لیکن ان کو ۶ دسمبر تک دوبارہ گرفتار نہیں کیا جاسکا۔ ان کو سندھ پولیس کے انسداد دہشت گردی شعبہ نے زیادہ تر شیعہ فرقہ کے ارکان اور قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں سمیت ۶۰ سے زیادہ افراد کو قتل کرنے پر گرفتار کیا تھا۔ بعد ازاں کی گئی تفتیش میں سی ٹی ڈی نے جیل حکام

کے جہادی عناصر اور ایم کیو ایم کے قیدیوں سے خوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حکام نے ڈر کے مارے قیدیوں کو جیل سنٹرل جیل چلانے کی خود ساختہ اجازت دے رکھی تھی۔

مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کی بہ نسبت زیادہ برے برتاؤ کا سامنا تھا اور اکثر ساتھی قیدیوں کا تشدد بھی برداشت کرنا پڑا۔ احمدی اور عیسائی برادری کے نمائندوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے ارکان سے جیل میں اکثر بدسلوکی کی گئی۔ سول سوسائٹی کے اداروں نے بتایا کہ توہین رسالت کے قیدی اکثر ابتر حالات کا شکار تھے۔ غیر سرکاری اداروں نے رپورٹ کیا کہ توہین رسالت کے ملزمان کو لمبی مدت کے لیے قید تنہائی میں رکھا گیا، کبھی کبھی تو یہ مدت ایک سال کی تھی۔ حکومت کے مطابق یہ برتاؤ درحقیقت ان افراد کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے کیا گیا تھا کیوں کہ توہین رسالت کے ملزم قیدیوں کو دیگر عام قیدی آبادی سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

حکام نے خواتین قیدیوں کو مردوں سے علیحدہ رکھا۔ این جی اوز نے رپورٹ دی کہ مخنث، خواجہ سرا خواتین کو مردوں کے ساتھ رکھا گیا اور ان کو خوف وہراساں کیا گیا۔ بلوچستان میں عورتوں کی کوئی بھی جیل موجود نہیں مگر عورتوں کو خضدار، گڈانی، کوئٹہ اور لورالائی جیل کے اندر علیحدہ بیرکوں میں رکھا گیا۔

عمارتوں کی کمی کے باعث، پولیس نے ملزموں کو مجرموں سے الگ نہیں رکھا۔ ذہنی بیماریوں سے دوچار قیدیوں کو مناسب دیکھ بھال کی سہولت میسر نہیں تھی۔

جیل حکام نے کم عمر ملزموں کو بالغ افراد سے علیحدہ بیرکوں میں رکھا۔ کم عمر ملزم ٹرانسپورٹ کا انتظار کرتے وقت بالغ افراد کی قریب تھے مگر اس مرتبہ ان کو احتیاط کے ساتھ زیرِ نگرانی رکھا گیا۔ سوسائٹی فار دی پروٹیکشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ (اسپارک) کے مطابق قیدیوں اور جیل عملے نے بچوں سے بدسلوکی، جنسی زیادتی اور مختلف قسم کے تشدد روا رکھے۔ اسپارک نے ملک میں کم عمر قیدیوں کے حالات کو بدترین قرار دیا۔

انتظامیہ: شارپ کے مطابق قیدیوں کے بارے میں تحریری ریکارڈ موجود تھا مگر ریکارڈ کو کمپیوٹرائیزڈ کرنے کی ضرورت تھی۔

زیرِ حراست افراد کے بارے میں محتسب، اسلام آباد میں صدر دفتر اور ہر صوبے میں آفس کے ساتھ، موجود تھا۔ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات نے حالات کا جائزہ لینے اور شکایتیں نمٹانے کے لیے وقتاً فوقتاً جیلوں اور حراستی مراکز کے دورے کیے۔

قانون کے مطابق جیل حکام قیدیوں اور زیرِ حراست افراد کو ضرور اس بات کی اجازت دیں کہ وہ عدلیہ کے حکام کو بغیر قدغن کے شکایت جمع کرائیں اور غیر انسانی حالات کی مصدقہ اطلاعات کی تفتیش کے لیے درخواست دیں۔ شارپ کے مطابق، اس کے برعکس، قیدیوں نے اکثر اوقات جیل حکام کی انتقامی کارروائی کے خوف سے شکایات درج کرانے سے گریز کیا۔

غیر جانبدار نگرانی: جیلوں کی جانچ پڑتال کرنے والی بین الاقوامی تنظیموں نے بتایا کہ ان کو حراستی مراکز تک، خاص طور پر جہاں سیکیورٹی سے متعلقہ افراد زیرِ حراست تھے، رسائی میں مشکلات کا سامنا تھا۔ حکام نے بین الاقوامی تنظیموں کو تشدد سے زیادہ متاثر ہونے والے علاقوں کے پی، فاٹا اور بلوچستان کے حراستی مراکز تک رسائی کی اجازت نہیں دی۔ سندھ، گلگت بلتستان اور آزاد جموں و کشمیر کی صوبائی حکومتوں نے کچھ بین الاقوامی تنظیموں کو سویلین جیلوں میں حالات کی جانچ پڑتال کی اجازت دی لیکن ان مانیٹرنگ کرنے والے اداروں کے سربراہان کا کہنا تھا کہ سال بہ سال ان کا کام محدود ہوتا جارہا ہے۔

مقامی، صوبائی اور قومی سطح پر حکام نے انسانی حقوق کے چند گروپوں اور صحافیوں کو کم عمر اور خواتین قیدیوں کے حالات کی مانیٹرنگ کرنے کی اجازت دی۔

بہتری: بنیادی ڈھانچے کی بہتری، پہلے سے موجود جیلوں میں نئی پالیسیوں اور نئی سہولیات کی تعمیر کی بدولت، عدالتی کارروائی کے منتظر اور سزا یافتہ قیدیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے اقدامات میں تیزی آئی۔

(د)۔ بلاجواز گرفتاری یا حراست

قانون بلاجواز گرفتاری یا حراست سے منع کرتا ہے اور کسی بھی شخص کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری یا حراست کی قانونی حیثیت کو عدالت میں چیلنج کرے، لیکن حکام نے اکثر قانونی تقاضوں کو مدِ نظر نہیں رکھا۔ بدعنوانی اور استثنیٰ نے ہمیشہ اس مسئلے کو پیچیدہ بنایا۔

پولیس اور سلامتی کے اداروں کا کردار

ملک کے بیشتر علاقوں میں داخلی سلامتی کی بنیادی ذمہ داری پولیس کے کندھوں پر ہے۔ مقامی پولیس صوبائی حکومتوں کے ماتحت ہیں۔ پولیس کا اثر و رسوخ ہر ضلع میں تبدیل ہے، کہیں بہتر تو کہیں بالکل غیر مؤثر۔ رینجرز، وزارت داخلہ کے اختیار کے ماتحت نیم فوجی ادارہ ہے، جس کی سندھ اور

پنجاب میں شاخیں ہیں۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری (ایف سی) بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں رینجرز کی ہم منصب ہے، یہ امن کے دور میں وزارتِ داخلہ اور جنگ کے دوران فوج کو جواب دہ ہے۔ فوج بیرونی سلامتی کی ذمہ دار ہے لیکن داخلی سلامتی میں کردار جاری رکھے ہوئے ہے۔

ایف سی آر فاٹا میں قانون اور حکمرانی کا ڈھانچہ فراہم کرتا ہے، جس کا نفاذ گورنر کے ماتحت مقرر شدہ پولیٹیکل ایجنٹوں کے توسط سے ہوتا ہے۔ عدالتی سرشتہ اور عدلیہ کی فاٹا میں عملدرآمد کی حدود نہیں ہے۔ ایف سی آر کے تحت، جرگہ (مقامی برادری کے سربراہوں کا اتفاق رائے سے فیصلہ کرنے والا گروہ) مقامی باسیوں کو وکیل حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر ملزم بالغ ہے تو وہ جرگہ کے سامنے اپنے دفاع کے لیے ذاتی طور پر پیش ہوتا ہے۔ والدین عام طور پر اپنے چھوٹے بچوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور مرد اپنی رشتہ دار خواتین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مبصرین اکثر ایف سی آر کی سخت دفعات پر تنقید کرتے ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں، حکام نے ان میں سے کچھ دفعات میں ترامیم کیں، جن میں قبیلے کے لیے اجتماعی سزا قانون میں تبدیلی، پولیٹیکل ایجنٹ اور ضلعی رابطہ افسر کے جبری طرز کے اختیارات کو محدود کرنے اور شہریوں کو منظم قبائلی سرشتے کے اندر رہتے ہوئے پولیٹیکل ایجنٹ کی جانب سے کیے گئے فیصلوں کو چیلنج کرنے کے محدود حقوق شامل تھے۔

فاٹا میں پولیس کی جگہ پر مختلف قانون نافذ کرنے والے ادارے کام کر رہے تھے۔ ان میں نیم فوجی دستے فرنٹیئر کور، فرنٹیئر کانسٹیبلری، خاصہ دار (قبائلی پولیس) اور فاٹا لیویز فورس شامل ہے، جو قیام امن کے لیے پولیٹیکل ایجنٹ (ہر قبائلی علاقے کے مقرر شدہ انتظامی سربراہ) کو رپورٹ کرتی ہے۔ قبائلی عمائدین نے امن وامان کی عارضی مسائل سے نمٹنے کے لیے لشکر (قبائلی جنگجو) بلائے، لیکن انہوں نے باضابطہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کے طور پر نہیں، بلکہ نجی قبائلی عسکری قوت کے طور پر فرائض سرانجام دیئے۔ فاٹا کی کرم ایجنسی کے علاقہ پاراچنار میں ۳۰ جون کو تین علیحدہ بم دھماکوں میں ۱۲۰ ہلاکتوں کے بعد فوج نے ایف سی کی جگہ عارضی طور پر سیکیورٹی کی ذمہ داری سنبھالی۔ بم حملوں کے بعد سات دن تک احتجاج برپا ہوئے، جن میں یہ خیال ظاہر کیا جارہا تھا کہ ایف سی پاراچنار کے شہریوں کی حفاظت کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔

سزاؤں میں ناکامی نے پورے ملک میں قانون سے بالاتر ہونے کے تاثر کو مضبوط کیا۔ سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق، پولیس اور جیل حکام نے قیدیوں اور ان کے خاندانوں سے پیسے بٹورنے کے لیے تشدد کی دھمکی کو استعمال کیا۔ انسپکٹر جنرل، ضلع پولیس، ضلع ناظم (مقامی حکومتوں کے مرکزی منتخب شدہ سربراہ)، صوبائی وزیر داخلہ یا وزیر اعلیٰ، وفاقی وزیر داخلہ، وزیر اعظم، یا عدالتیں ظلم کے واقعات کی اندرونی تفتیش یا انتظامی پابندیوں کا حکم صادر کر سکتے ہیں۔ ایگزیکٹو برانچ اور پولیس حکام کو اختیارات ہیں کہ وہ فوجداری کی کارروائی کی سفارش کریں یا عدالتیں بھی ایسی کارروائی کا حکم دے سکتی ہیں۔ سیکیورٹی فورسز کی جانب سے کی گئی جبری کارروائیوں کی تفتیش کے لیے عدالتی نظام واحد دستیاب ذریعہ تھا۔ ۲۰۱۵ء میں قائم شدہ نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس (این سی ایچ آر) خفیہ اداروں کے خلاف شکایات نہیں سن سکتا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کو مجاز حکام کی طرف ارسال کر دے۔ این سی ایچ آر وفاقی حکومت سے آرمڈ فورسز کے خلاف کی گئی شکایت پر رپورٹ طلب کر سکتا ہے اور رپورٹ وصول ہونے کے بعد وہ یا تو کارروائی ختم کر سکتا ہے یا وفاقی حکومت کو مزید اقدامات کی سفارش کر سکتا ہے۔

مذکورہ سال کے دوران، حکومت نے داخلی سلامتی میں اعانت کے لیے فوج کی خدمات کا استعمال جاری رکھا۔ نیم فوجی دستے، بشمول رینجرز اور فرنٹیئر کانسٹیبلری اسلام آباد کے کچھ علاقوں میں حفاظت کے فرائض سرانجام دیتے رہے جبکہ کراچی میں بھی آپریشن جاری رکھا۔ بڑے پیمانے کے دہشتگرد حملوں کے بعد ۲۲ فروری کو فوج نے، وسیع سول اور نیم فوجی دستوں کے تعاون سے آپریشن ردالفساد کا آغاز کیا۔ انسداد دہشت گردی کے لیے اعلیٰ درجہ کی کوشش کی عکاسی کرتے ہوئے، آپریشن کے دوران صوبہ پنجاب میں نیم فوجی رینجرز دستوں کی تعیناتی بھی شامل تھی۔

جنوری ۲۰۱۵ء میں، پشاور آرمی اسکول پر حملے کے بعد، پارلیمینٹ نے دہشتگردی، عسکریت پسندی، فرقہ ورانہ تشدد اور دوسرے الزامات میں ملوث سویلین شہریوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کی آئینی ترمیم منظور کی۔ ترمیم میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ان عدالتوں کو سویلین کے خلاف مقدمہ چلانے کا دیا گیا اختیار جنوری ۲۰۱۷ء میں ختم ہو جانا تھا لیکن حکومت نے ترمیم کو دوبارہ فعال کرتے ہوئے ان عدالتوں کے مینڈیٹ کی مدت میں جنوری ۲۰۱۹ء تک توسیع کر دی۔ سول سوسائٹی کے ارکان نے شفافیت کی کمی اور سول عدالتی نظام کے فالتو اور غیر ضروری ہونے کا حوالہ دیتے ہوئے سویلین ملزموں کے خلاف کارروائی کے لیے فوجی عدالتوں کے استعمال پر اظہارِ تشویش کیا۔

پولیس اکثر مذہبی اقلیتوں-بشمول احمدی، عیسائی، شیعہ، اور ہندوؤں۔ کو حملوں سے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی۔ ہجوم نے تشدد کے ساتھ ساتھ اکثر توہین مذہب کے الزامات بھی لگائے اور سال بھر کے دوران اکثریت واقلیت دونوں سے تعلق رکھنے والے توہین مذہب کے ملزمان کے قتل کے واقعات رونما ہوئے۔ سب سے زیادہ نمایاں واقعہ خیبر پختونخواہ کے شہر مردان میں پیش آیا جہاں ایک ہجوم نے جامعہ کے طالبعلم مشال خان کو توہین رسالت میں ملوث ہونے کے افواہوں کے بعد قتل کر دیا، پولیس افسران نے موقع پر موجود ہونے کے باوجود اس واقعہ کو روکنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

شیعہ تنظیموں نے شکایت کی کہ سندھ اور بلوچستان کے راستے ایران جانے والے زائرین کو حکومت مناسب حفاظت فراہم کرنے میں ناکام رہی۔

پولیس کے پیشہ ورانہ برتاؤ میں بہتری آئی اور حکام کی جانب سے اقلیتوں کو امتیازی سلوک اور مذہبی بنیادوں پر روا رکھے جانے والے تشدد سے بچانے کے واقعات دیکھے گئے۔ ماہِ اگست میں، پنجاب کے علاقے علی پور چٹھہ میں پولیس نے توہین رسالت کے ملزم ایک عیسائی لڑکے کو مشتعل ہجوم سے بچایا۔ انسانی حقوق کی مقامی تنظیموں کے مطابق، ہجوم نوعمر لڑکے کو زدوکوب کر رہا تھا تو پولیس نے مداخلت کرتے ہوئے اس کو حفاظتی تحویل میں لیا اور توہین رسالت کے الزامات ابھی زیرِ التواء ہیں۔

طریقہ ہائے گرفتاری اور زیر حراست افراد کے ساتھ برتاؤ

جب پولیس کو کسی بھی قابل دست اندازی جرم کی اطلاع موصول ہو تو فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (ایف آئی آر) بھی گرفتاری کی قانونی بنیاد ہے۔ عام طور پر تیسرا فریق ایف آئی آر درج کراتا ہے لیکن پولیس خود بھی ایف آئی آر درج کر سکتی ہے۔ ایف آئی آر کی بنیاد پر پولیس ملزم کو ۲۴ گھنٹے کے لیے پکڑ سکتی ہے، جس کے بعد اگر پولیس درخواست کرے کہ تفتیش کے غرض سے ثبوت حاصل کرنے کے لیے ملزم کو رکھنا ضروری ہے تو پھر مجسٹریٹ مزید ۱۴ دن کے لیے تحویل میں رکھنے کا حکم دے سکتا ہے۔ کچھ حکام نے گرفتاری کی ان حدود کا لحاظ نہیں رکھا۔ حکام نے مبینہ طور پر گرفتار افراد کو ہراساں کرنے یا دھمکانے کے لیے بغیر ثبوتوں کے ایف آئی آر درج کیں یا پھر دوسری جانب مناسب ثبوت فراہم کیے جانے کے باوجو شکایت درج کرانے والے سے رشوت لیے بغیر پرچہ نہیں کاٹا۔ اس کے علاوہ عدالتی وارنٹ کے بغیر گرفتاریوں اور اور قیدیوں سے ملاقات کے لیے جانے والوں سے رشوت لیے جانے کی بھی اطلاعات تھیں۔

وزارت داخلہ نے اکثر واقعات میں غیر ملکیوں کی گرفتاری کی اطلاع ان کے متعلقہ سفارتخانوں یا قونصل خانوں تک نہیں پہنچائی۔ ۲۰۱۵ء میں وزارت نے ایک نیا ضابطہ متعارف کرایا کہ غیر ملکی مشن کو انکے گرفتار شہریوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پیشگی درخواست ۲۰ دن پہلے دینی ہو گی۔

ضمانت کا ایک فعال نظام موجود تھا، تاہم، انسانی حقوق کے گروہوں نے بتایا کہ ججوں نے کبھی کبھی رشوت کی ادائیگی پر ضمانت دینے سے انکار کیا۔ این جی اوز نے اطلاع دی ہے کہ حکام نے کبھی کبھی توہین رسالت کے مقدمات میں ضمانت دینے سے یہ جواز بتا کر انکار کیا کہ ملزم ممکنہ پھانسی کی سزا کے ڈر سے فرار ہو جائے گا یا پھر اس کو خود ساختہ عوامی انصاف سے خطرہ لاحق ہے۔ غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق توہین رسالت کے ملزموں کے وکلاء نے بھی اپنے مؤکل کو عوامی تشدد سے بچانے کے لیے حراست میں رکھنے کی استدعا کی۔ انسداد دہشت گردی ایکٹ یا ۲۰۱۵ء کی آئینی ترمیم کے تحت قائم ہونے والی فوجی عدالتوں میں ضمانت کی سہولت میسر نہیں ہے۔

حکومت نے سزائے موت کا سامنا کرنے والے قیدیوں کو ریاست کی مالی معاونت سے قانونی مدد فراہم کی، لیکن دیگر مقدمات میں ملزمان کو باقاعدگی سے سرکاری قانونی نمائندگی فراہم نہیں کی گئی۔ آئین حبسِ بے جا کے حق کو تسلیم کرتا ہے اور اعلیٰ عدالتوں کو یہ مطالبہ کرنے کی آئینی اجازت دیتا ہے کہ کسی بھی جرم کے ملزم کو عدلیہ کے سامنے ضرور پیش کیا جائے۔ قانون بھی شہریوں کو عدالتوں میں حبسِ بے جا کی درخواستیں دائر کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبری گمشدگی کے کئی واقعات میں ججوں کے احکامات کے باوجود حکام زیر حراست افراد کو پیش کرنے میں ناکام رہے۔

بلاجواز گرفتاری: ایسی بھی اطلاعات ہیں کہ پولیس نے رشوت بٹورنے کے لیے لوگوں کو بلاجواز گرفتا کیا یا مطلوبہ افراد کے رشتہ داروں کو گرفتار کیا تاکہ ملزمان کو پولیس کے سامنے پیش ہونے پر مجبور کیا جاسکے۔ کراچی میں روہنگیا نسل کے جن افراد کے پاس سرکاری شناختی دستاویزات کی کمی تھی، انہوں نے پولیس کی جانب سے بلاجواز گرفتاریوں اور ہراساں کئے جانے کی شکایات کیں۔

عدالتی کارروائی سے قبل گرفتاری: پولیس نے کبھی کبھار مجسٹریٹ سے منظوری لیے بغیر لوگوں کو تفتیشی حراست میں رکھا اور اکثر گرفتار افراد کو بغیر کسی الزام کے اس وقت تک بند رکھا جب تک کسی عدالت نے یہ گرفتاری چیلنج نہیں ہوگئی۔ پولیس کی طرف سے لوگوں کو تفتیش کے لیے حراست میں رکھنے کی درخواست مجسٹریٹوں نے عام طور پر بغیر کسی جواز کے منظور کی۔ جب پولیس ۱۴ دن کی مدت کے اندر ملزم کی جرح کے لیے مطلوبہ ثبوت جمع نہیں کر سکی تو اس نے مجسٹریٹ کو درخواست دی کہ ملزم کے خلاف نئی ایف آئی آر داخل کی جائے، جس سے اُس فرد کی حراست کی مدت میں اضافہ ہوا۔

قانون کے تحت زیر حراست افراد کی گرفتاری کے تیس دن کے اندر لازمی طور پر مقدمہ کی سماعت کی جانی چاہیے۔ لیکن کچھ استثنیٰ موجود تھے: ایک ضلعی رابطہ افسر کے پاس ۹۰ دن کے لیے "امن عامہ کی بحالی" کے سلسلے میں احتیاطی حراست کی سفارش کرنے کا اختیار ہے اور اس میں وزارت داخلہ کی منظوری کے ساتھ مزید ۹۰ دن کی توسیع بھی کی جاسکتی ہے۔

کچھ مقدمات میں ایف آئی آر داخل ہونے کے چھ مہینے بعد تک بھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہیں ہو سکی، اور بعض افراد مقدمہ کی سماعت شروع ہونے سے قبل ہی اس سے زیادہ عرصہ قید کاٹ چکے تھے، جتنی ان پر جرم میں ثابت ہونے کی صورت میں ملتی۔ شارپ کے اندازے کے مطابق جیلوں میں قید ۷۰ فیصد سے زیادہ افراد مقدمہ کی سماعت کا انتظار کر رہے تھے۔ حکام نے شاذ و نادر ہی قیدیوں کو ان کے اوپر لگائے گئے الزامات کے بارے میں فوری طور پر مطلع کیا۔

بدعنوانی کے مقدمات کی تفتیش اور سزا دلانے والے قومی احتساب بیورو (نیب) کی طرف سے عدالت میں لائے جانے والے مقدمات پر خصوصی قوانین لاگو ہوتے ہیں۔ نیب ملزم کو جرم عائد کیے بغیر ۱۵ دن تک زیر حراست رکھ سکتا ہے (عدلیہ کی اتفاق رائے کے ساتھ قابل تجدید) اور فردِ جرم عائد کرنے سے پہلے ملزم کی وکیل تک رسائی کی درخواست مسترد بھی کر سکتا ہے۔ نیب سے وابستہ جرم ناقابل ضمانت ہیں اور فقط نیب چیئرمین کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ گرفتار افراد کو رہائی دی جائے یہ نہیں۔

فاٹا میں ایف سی آر کے تحت پولیٹیکل ایجنٹ کو مختلف بنیادوں پر افراد کی احتیاطی گرفتاری کرنے کا قانونی اختیار حاصل ہے اور وہ ناپسندیدہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ضمانتی مچلکے بھی طلب کر سکتا ہے۔ غیر معینہ مدت کے لیے حراست میں رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور زیر حراست افراد ایف آر سی ٹربیونل میں اپیل کر سکتے ہیں۔ قیدیوں کو غلط سزا ملنے کی صورت میں معاوضہ لینے کا حق حاصل ہے۔ مقدمات کا مقررہ مدت کے اندر فیصلہ ہونا چاہئے جبکہ حکام گرفتار افراد کو ضمانت پر رہا کر سکتے ہیں۔ قواعد وضوابط کا تقاضا ہے کہ زیر حراست افراد کو گرفتاری کے ۲۴ گھنٹوں کے اندر ایف سی آر حکام کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے، جو کہ پولیٹیکل ایجنٹوں کے اس اختیار کو غیر فعال کر دیتا ہے کہ وہ احتیاطی گرفتاری کا حکم دیں اور افراد کو تین سال تک قید میں رکھیں۔ ملزم کو دو سطح کے سرشتہ کے تحت اپیل کا حق ہے، جو ایک اپیلیٹ اتھارٹی سے شروع ہوتا ہے جس میں ایف سی آر کمشنر اور ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر شامل ہوتا ہے۔

فاٹا، پاٹا اور خیبر پختونخوا میں، سیکورٹی فورسز دہشتگردی کے مشتبہ افراد کی سرگرمیوں کو محدود کر سکتی ہیں، ان کے اثاثے ۴۸ گھنٹوں تک قبضہ میں لے سکتی ہیں اور ان کو بغیر الزامات کے ایک سال کے عرصے کے لیے گرفتار کر سکتی ہیں۔ انسانی حقوق اور بین الاقوامی تنظیموں نے اطلاع دی ہے کہ حکام نے دہشتگرد تنظیموں سے منسلک ہونے کے الزام میں نامعلوم تعداد میں افراد کو زیر حراست رکھا، جہاں انہیں اکثر اوقات اذیتیں دی گئیں اور ان سے بدسلوکی روا رکھی گئی۔ بہت سے مقدمات میں حکام نے ملزموں کو قید تنہائی میں رکھا اور ان کو مرضی کے وکیل تک جلد رسائی نہیں دی۔ اکثر خاندان کے لوگوں کو بھی زیر حراست افراد تک فوری طور پر رسائی نہیں دی گئی۔

۲۰۱۱ء کا ایکشن اِن ایڈ سول پاور ریگولیشن (۲۰۰۸ء سے نافذ شدہ) فاٹا اور پاٹا میں سویلین حکومت کی جانب سے بلائے جانے پر فوج کو مشتبہ دہشتگردوں کو پکڑنے کے لیے قانونی اختیار فراہم کرتا ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے فوجی اختیارات کو توسیع دینے کی سہولت دینے اور جائز قانونی طریقہ ہائے کار کو پائمال کرنے کی وجہ سے یہ قانون درحقیقت آئین کی خلاف ورزی ہے۔ اس قانون کے تحت قیدیوں کی حراستی مراکز میں منتقلی مستقل بنیادوں پر جاری رہی۔

زیر حراست افراد کی جانب سے گرفتاری کی قانونی حیثیت عدالت میں چیلنج کرنے کی صلاحیت: ایسے زیر حراست افراد کے بارے میں اطلاعات موجود تھیں کہ جن کو اپنی حراست کی قانونی بنیاد یا نوعیت عدالت میں چیلنج کرنے، قانونی امداد یا معاوضہ وصول کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

(ہ)۔ منصفانہ کھلے عام عدالتی کارروائی سے انکار

قانون ایک آزاد عدلیہ فراہم کرتا ہے، لیکن غیر سرکاری تنظیموں اور قانونی ماہرین کے مطابق، عدلیہ اکثر بیرونی اثر ورسوخ سے متاثر رہی، مثال کے طور پر توہین رسالت اور دہشتگردی کے مقدمات میں انتہا پسند عناصر کی طرف سے بدلے کا خوف یا پھر ہائی پروفائل مقدمات کو سیاسی رنگ دینا۔ سول

سوسائٹی تنظیموں نے رپورٹ کیا کہ خود ساختہ عوامی انصاف کے خدشات کے باعث جج صاحبان توہین رسالت کے ملزمان کو بری کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ذرائع ابلاغ اور عوام نے عام طور پر ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کو قابل اعتبار قرار دیا۔

ماتحت اور اعلیٰ عدالتوں میں بڑے پیمانے پر زیر التوا مقدمات اور دیگر مسائل نے انصاف کی مؤثر فراہمی، شفاف اور کھلی سماعت کے حق کو متاثر کیا۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات میں انصاف فراہم ہونے کے میں تاخیر کے اسباب میں فرسودہ قواعد وضوابط، ججوں کی خالی اسامیاں، مقدمات کی کمزور تیاری اور قانون کی غیر معیاری تعلیم شامل تھے۔ پنجاب میں وکلاء کی ہڑتالوں نے سماعت میں تاخیر میں اضافہ کیا۔ ستمبر ۲۰۱۶ء سے مارچ تک پنجاب کے ۳۶ اضلاع میں وکلاء نے ۴۷۴، ہڑتالیں کیں، جن سے عدالتی کارروائیوں میں سخت رخنہ پڑا۔ لاہور ہائی کورٹ نے عدالتی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات اٹھائے۔ عدالت کے چیف جسٹس نے ہڑتالوں کو کم کرنے اور تنازعات کے حل کے لیے متبادل نظام وضع کرنے کی غرض سے قانونی اصلاحات متعارف کرائیں۔ عدالت نے تنازعات کے حل کے لئے مراکز قائم کیے، جن کو چھ مہینے میں ۸۸۳، ۳ ریفرنس ملے اور ان میں سے ۴۹۷، ۲ ماہ اگست تک حل کیے جا چکے تھے۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کی عملداری کافی ایسے علاقوں میں نہیں جہاں علیحدہ عدالتی نظام نافذ ہے، مثال کے طور پر آزاد جموں وکشمیر کے پاس اپنا منتخب شدہ صدر، وزیر اعظم، قانون ساز شوریٰ اور عدالتی نظام ہے۔ گلگت بلتستان کے پاس بھی اپنا الگ نظام عدل ہے۔

بہت سی ماتحت عدالتیں بدعنوان، غیر مؤثر ہیں اور اہل اور امیر یا بااثر مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کے دباؤ میں رہیں۔

ایسی مثالیں دیکھی گئیں کہ اعلیٰ سطح کے مقدمات میں نامعلوم افراد نے گواہوں، وکلاء اور تحقیقات کرنے والے پولیس افسران کو دھمکیاں دیں یا قتل کر دیا۔ پریس کی خبروں کے مطابق، فروری ۱۵ کو خودکُش بمبار نے پشاور میں چار ججوں کو لے جانے والی وین کو نشانہ بنایا۔ حملے میں گاڑی کا ڈرائیور جاں بحق جبکہ چار جج زخمی ہوئے۔

عدل کے غیر رسمی سرشتے کسی ادارے کی قانونی سرپرستی کے بغیر فعال رہے، خاص طور پر دیہی علاقوں میں، جبکہ یہ سرشتے بہت مرتبہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں ملوث رہے۔ سندھ اور پنجاب میں جاگیرداروں اور دیگر برادری کے سربراہوں نے جبکہ پشتون اور بلوچ علاقوں میں قبائلی سرداروں نے بعض اوقات نافذ العمل قومی قانون کے دائرے سے باہر رہ کر پنچایت اور جرگے منعقد کیے۔ ان جرگوں نے تنازعات کو حل کیا اور قبائلی سزائیں دیں، بشمول جرمانے، قید اور کبھی کبھار سزائے موت۔ ان جرگوں نے نام نہاد غیرت کے مقدمات میں عورتوں کو پُر تشدد سزا یا سزائے موت بھی سنائی۔ فاٹا میں ایسے جرگے ایف سی آر کے مروجہ قواعد کے تحت ہوئے۔ فاٹا میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ، اپنے منتخب کردہ قبائلی عمائدین کے تعاون سے، انصاف کی فراہمی کے قانونی طور پر ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے اسلامی قوانین کی اپنی تشریح اور قبائلی روایات کے مطابق مقدمات کی سماعت کی۔

مقدمہ کا طریقہ ہائے کار

دیوانی و فوجداری اور فیملی عدالتی سرشتے مقدمہ کی شفاف سماعت اور قانونی طریقہ ہائے کار، بے قصور تصور کیے جانے، جرح اور اپیل کا حق فراہم کرتے ہیں۔ "جیوری" کی طرف سے ٹرائل کا سرشتہ موجود نہیں ہے۔ ملزم کے پاس حاضر رہنے اور وکیل سے مشورہ کرنے کا حق موجود ہے، جبکہ پھانسی جیسے سنگین مقدمات میں بے سہارا ملزم کے لیے وکیل مقرر کرنا عدالت کی ذمہ داری ہے۔ عام طور پر نچلی عدالتوں میں قانونی نمائندگی کی لاگت ملزم کو خود ادا کرنی ہوتی ہے، لیکن اپیلیٹ عدالتوں میں سرکاری خراجات پر وکیل فراہم کیا جاسکتا ہے۔ ملزم استغاثہ کے گواہوں سے اختلاف اور سوال کرسکتے ہیں اور اپنے گواہ اور ثبوت بھی پیش کرسکتے ہیں۔ ججوں کی کمی، پرانے مقدمات کے انبار، طویل عدالتی طریقہ ہائے کار، بار بار کے التوا اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے مقدمات عام طور پر کئی سال تک جاری رہے اور ملزمان کو بار بار کچہری میں حاضری لگانی پڑی۔

اسپارک نے رپورٹ کیا کہ نابالغ مجرموں کے لیے خصوصی عدالتوں اور ججوں کی کمی کی وجہ سے کم عمر مجرموں کے مقدمات کے تصفیے کی رفتار سست روی کا شکار تھی۔ نابالغ افراد کے لیے منصفانہ اور شفاف نظام انصاف موجود نہیں تھا۔ بہت سے نابالغ مجرموں نے طویل مدت سلاخوں کے پیچھے گزاری کیونکہ وہ ضمانت کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اسپارک کے مطابق، لمبے عرصے تک بالغ قیدیوں کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے بچے قیدی سدھرنے کے بجائے زیادہ بڑے مجرم بن گئے۔

عدالتی سرشتہ میں نابالغ قیدیوں سے برتاؤ کا تعین کرنے والا "جووینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس" دہشتگردی اور منشیات کے جرائم کے ملزمان پر لاگو نہیں ہوتا۔ اسپارک نے کہا کہ، ماضی میں، حکام نے انسداد دہشتگردی ایکٹ کے تحت ۱۲ سال کی عمر تک کے چھوٹے بچوں کو دہشتگردی کے الزام میں گرفتار کیا۔ اس ایکٹ کے تحت فرد جرم عائد کیے گئے بچوں کو سزائے موت بھی ہوسکتی تھی۔ ایسے بیشمار افراد کے مقدمات موجود تھے جو ۱۸ سال سے کم عمر کے دوران سرزد ہوئے جرائم کی وجہ سے سزائے موت کے منتظر تھے۔ دستاویزات کی کمی قانونی عمر کی تصدیق میں ایک رکاوٹ بنی رہی۔ سول سوسائٹی کے ذرائع نے بتایا کہ اگرچہ سزائے موت پانے والوں کی فہرست میں نابالغ افراد کی موجودگی کے بارے میں کوئی اطلاعات نہیں لیکن اس امکان کو مسترد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مختلف عدالتوں نے مناسب عمر کا تعین کرنے کے لیے مختلف فیصلے کئے۔

عدالتوں میں زیر سماعت مقدموں میں شفافیت کی کمی ہونے کی مثالیں موجود تھیں، خاص طور پر اگر معاملہ ہائی پروفائل یا حساس نوعیت کا تھا۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ حکومت نے سیکورٹی کے خدشات کی وجہ سے اکثر مقدمے کی سماعت جیلوں میں ہی کی، جو کہ ملزموں، وکیلوں، ججوں، سرکاری وکیلوں اور گواہوں تک محدود تھی۔ غیر سرکاری تنظیموں نے جیل کے اندر مقدمات پر پہرے اور ملزمان کو وکیل سے مشورہ کرنے کے لیے درکار رازداری کے مواقع کی کمی پر تشویش کا اظہار کیا۔

پُر تشدد جرائم، دہشتگردی کی سرگرمیوں اور واقعات، مذہبی منافرت یا ریاست مخالف سرگرمیوں کو اشتعال دینے والی تقریر کو روکنے کے لیے انسدادِ دہشت گردی کا قانون حکومت کو خصوصی، براہ راست انسداد دہشت گردی (اے ٹی سی) عدالتیں بروئے کار لانے کی اجازت فراہم کرتا ہے۔ عام عدالتوں میں تو مشتبہ افراد کو ان کی گرفتاری کے سات دنوں کے اندر عدالت میں پیش کرنا لازمی ہے لیکن اے ٹی سی اس مدت کو بڑھانے کے معاملہ میں خود مختار ہیں۔ انسانی حقوق کے کارکنوں نے اس تیز رفتار متوازی نظام کی موجودگی پر تنقید کرتے ہوئے الزام لگایا کہ اس کے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ پنجاب کے پراسیکیوٹر جنرل کے مطابق، ۲۰۱۴ء میں، ایک جج نے رولنگ دی کہ دہشتگردی کے خاتمے کا قانون غلط طریقے سے استعمال ہوا ہے، جس کے بعد حکام نے ابتدائی طور پر اے ٹی سیز میں منتقل کیے گئے ۱۵ فیصد مقدمات عام عدالتوں میں واپس کر دیے۔ غیر سرکاری تنظیموں نے رپورٹ کیا کہ اگر سیاسی دباؤ یا جرم کی نوعیت سنگین ہونے کی وجہ سے کسی مقدمہ کو جلدی نمٹانے کی ضرورت پڑنے پر اکثر اس کو عام عدالتی نظام کے بجائے اے ٹی سی کی جانب ارسال کیا جاتا تھا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ عام عدالتی نظام کی نسبت کیس نمٹانے کی رفتار میں تیز ہونے کے دعویٰ کے باوجود انسداد دہشت گردی کہ یہ عدالتیں تیزی سے مقدمات نمٹانے کے معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہیں اور ان کے پاس زیر التویٰ مقدمات کا اچھا خاصا انبار موجود تھا۔

حکومت نے دہشتگردی اور متعلقہ الزامات میں ملوث عام شہریوں کے مقدمات کی پیروی کے لیے فوجی عدالتوں کا استعمال جاری رکھا۔ فوجی عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کھلے عام نہیں ہوتی (ملاحظہ کریں حصہ اول۔ د۔)۔

وفاقی شرعی عدالت نے عام طور پر حدود آرڈیننس کے تحت درج ہونے والے مقدمات کا جائزہ لیا، یہ قانون ۱۹۷۹ء میں فوجی رہنما محمد ضیا الحق کی جانب سے غیر ازدواجی تعلقات، غیر ازدواجی تعلقات کے جھوٹے الزامات، چوری اور شراب نوشی جیسے جرائم کی کی سزا کے لیے اسلامی قانون کی سخت تشریح کے تحت نافذ کیا گیا۔ اگر صوبائی ہائی کورٹ حدود کے مقدمہ میں اپیل کی سماعت کرنے کا فیصلہ کرلے تو پھر شرعی عدالت کے پاس صوبائی ہائی کورٹ کے فیصلے کا جائزہ لینے کے اختیارات کا فقدان ہے۔ عدالت عظمیٰ شریعت ایپلٹ بینچ کو بائے پاس کر کہ اس قسم کے اپیل والے مقدمات میں دائرہ اختیار اپنے ماتحت تصور کر سکتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت اسلامی قوانین کے منافی کی گئی قانون سازی کو ختم کر سکتی ہے، لیکن اس نوعیت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بنچ میں اپیل کی جاسکتی ہے اور بالآخر سپریم کورٹ کا فل [مکمل] بینچ ہی اسکی سماعت کر سکتا ہے۔

عدالتیں مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت میں حسب معمول ناکام رہیں۔ عدالتوں نے شیعہ، عیسائی، احمدی اور دیگر مذہبی اقلیتی گروہوں کے ارکان کے خلاف توہین رسالت کے قوانین کو امتیازی طور پر استعمال کیا۔ ماتحت عدالتوں نے اکثر توہین رسالت کے مقدمات میں مطلوبہ مناسب ثبوتوں کی فراہمی کا تقاضا تک نہیں کیا اور بعض سزا پانے والے افراد کئی سال جیل میں قید گزار چکے تھے اس سے پہلے کہ اعلیٰ عدلیہ نے ان کو ملنے والی سزا کو کالعدم قرار دیا یا ان کی آزادی کا حکم دیا۔

۲۰۱۵ء میں سپریم کورٹ نے توہین رسالت کے مقدمہ میں عیسائی عورت آسیہ بی بی کو ۲۰۱۰ء میں ملی ہوئی سزائے موت معطل کر دی، لیکن اپیل پر فیصلہ زیر التواء ہے۔ کسی بحث کے دوران حضرت محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی شان اقدس میں گستاخانہ کلمات ادا کرنے کا جرم ثابت ہونے پر ضلعی عدالت کی جانب سے اسے ۲۰۱۰ء میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس کے وکیل نے ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی تھی۔ اپیل اکتوبر ۲۰۱۶ء میں سُنی جانی تھی لیکن تین ججوں پر مشتمل بینچ کے ایک رکن کی جانب سے سماعت میں شرکت سے معذرت پر تاخیر ہوئی۔ عدالت نے اگلی سماعت کے لیے تاریخ مقرر نہیں کی ہے۔

آسیہ بی بی کے لیے صدارتی معافی کا کھلے عام مطالبہ کرنے والے گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے مقدمہ قتل میں حکام نے فروری ۲۰۱۶ء میں ممتاز قادری کو پھانسی دی۔

محکمہ خارجہ کی بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ بھی پڑھنے کے لیے مندرجہ ذیل لنک پر جائیں:
www.state.gov/religiousfreedomreport/

سیاسی قیدی اور زیر حراست افراد

کچھ سندھی اور بلوچ قوم پرست گروہوں نے دعویٰ کیا کہ حکام نے ان کے ارکان کو گرفتاری کے لیے نشان زد کیا اور انہیں سیاسی وابستگی یا خیالات کی بنیاد پر حراست میں لیا گیا۔ ۲۰۰۹ء میں صوبے کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے متعارف کرائے گئے پارلیمانی پیکیج برائے اصلاحات "آغازِ حقوقِ بلوچستان" کے تحت حکومت نے بلوچ سیاسی قیدیوں، رہنماؤں، جلاوطن اور مبینہ طور پر "ریاست مخالف" سرگرمیوں میں ملوث کارکنوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ ۲۰۱۵ء میں میں وفاقی اور بلوچستان کی صوبائی حکومت نے مشترکہ طور "پُرامن بلوچستان" کے نام سے ایک اور پیکج کا اعلان کیا جس میں مرکزی دھارے میں شمولیت کے خواہشمند "عسکریت پسندوں" کے لیے مالی اور دیگر مراعات کی پیشکش کی گئی۔ عام معافی کے اعلان کے باوجود، کچھ بلوچ گروہوں کے دعویٰ کے مطابق، ریاستی اداروں کی جانب سے قوم پرست رہنماؤں کی غیر قانونی گرفتاری جاری رہی۔ وائیس فار بلوچ مسنگ پرسنز کے جانب سے جمع کیے گئے لاپتا افراد کی تفصیلات میں قوم پرست جماعتوں اور طلبہ تنظیموں کے کئی نامور رہنماؤں کے نام شامل تھے۔

دیوانی عدالتی طریقہ ہائے کار اور تلافی کی صورتیں

انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالہ کے لیے شہری عدالت میں درخواست دائر کر سکتے ہیں اور عدالتوں نے عام طور پر ایسی شکایات ملنے پر اقدامات اٹھائے۔ شہری انسانی حقوق کی خلاف ورزی سمیت دیگر معاملات میں سرکاری حکام کے خلاف تلافی کے لیے دیوانی عدالتوں سے رجوع کر سکتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق دیوانی عدالتوں نے شاذ و نادر ہی ایسے مقدمات کا فیصلہ کیا جبکہ زیادہ تر مقدمات عدالت سے باہر ہی طے پا گئے۔ اگرچہ انتظامی شکایات کے ازالہ کے لیے سرکاری طریقہ کار موجود نہیں تھا لیکن غیر رسمی حل عام تھے۔ شہری اور تنظیمیں خلاف جاری ہونے والے فیصلوں کے خلاف انسانی حقوق کے علاقائی اداروں کو اپیل جمع نہیں کرا سکے لیکن بعض غیر سرکاری تنظیموں نے یورپی یونین اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو انسانی حقوق کے حوالے سے "فرضی رپورٹیں" پیش کیں۔

(و)۔ نجی زندگی، خاندان، گھر، یا خط و کتابت میں غیر قانونی یا جبری مداخلت

قانون کسی بھی ملکیت کی تلاش کے لیے عدالت کے جاری کردہ وارنٹ پیش کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ پولیس نے بعض اوقات اس قانونی ضرورت کو نظر انداز کیا اور مبینہ طور پر تلاشی کے دوران اشیاء بھی چوری کیں۔ حکام نے پولیس کو غیر قانونی دراندازی پر شاذ و نادر ہی سزا دی۔ پولیس نے بعض مواقع پر ملزم کو پیش ہونے پر مجبور کرنے کے لیے اس کے اہل خانہ کو گرفتار کیا۔ انسداد دہشت گردی کے تحت چلنے والے مقدمات میں حکومت نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو بغیر کسی وارنٹ کے کیس سے متعلقہ ملکیت کی تلاشی لینے اور قبضہ کرنے کی اجازت دی۔

کئی مقامی خفیہ اداروں نے سیاستدانوں، سیاسی طور پر سرگرم کارکنوں، مشتبہ دہشتگردوں، غیر سرکاری تنظیموں، غیر ملکی اداروں کے ملازمین، اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی نگرانی کی۔ ان اداروں میں انٹر سروسز انٹیلیجنس، پولیس کی اسپیشل برانچ، انٹیلیجنس بیورو اور ملٹری انٹیلیجنس شامل تھے۔ قابل اعتماد رپورٹوں کے مطابق حکام نے باقاعدہ موبائل کالز کو ٹیپ کیا اور ان کی نگرانی کی، برقی ذرائع سے ہونے والی خط و کتابت میں مداخلت کی اور عدالت کی اجازت کے بغیر ڈاک کھولی۔

(ز)۔ اندرونی تنازعہ کے دوران بُرا برتاؤ

عسکریت پسند اور دہشتگرد سرگرمیاں جاری رہیں، اور چاروں صوبوں اور فاٹا میں بیشمار خودکش دھماکے اور بم حملے ہوئے۔ عسکریت پسندوں اور دہشتگرد گروہوں، بشمول پاکستانی طالبان (تحریک طالبان پاکستان، یا ٹی ٹی پی)، لشکر جھنگوی اور دولتِ اسلامیہ صوبہ خراسان (آئی ایس ایس-کے) نے شہریوں، صحافیوں، کمیونٹی رہنماؤں، سیکورٹی فورسز، قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں اور اسکولوں کو بموں، خودکش دھماکوں اور دیگر قسم کے پُر تشدد

حملوں کا نشانہ بنایا اور سینکڑوں افراد کو ہلاک اور ہزاروں کو زخمی کیا۔ عسکریت پسندوں اور دہشتگرد گروہوں نے بسا اوقات مذہبی اقلیتوں پر وار کیے۔ بلوچستان میں کم شدت کی علیحدگی پسند بغاوت جاری رہی۔ سیکورٹی فورسز نے مبینہ طور پر عسکریت پسند گروہوں کے خلاف لڑائی میں ماورائے عدالت قتل کا ارتکاب کیا۔

عسکریت پسندوں کے ٹھکانے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے فوج نے انسداد بغاوت اور انسداد عسکریت پسندی کی بیشمار کارروائیاں کیں۔ ۲۰۱۴ء میں فوج نے فاٹا میں غیر ملکی اور مقامی دہشتگردوں کے خلاف آپریشن ضربِ عضب شروع کیا۔ یہ آپریشن فروری تک جاری رہا، جس کے بعد فوج نے اس کو آپریشن ردالفساد سے تبدیل کیا، جو کہ آپریشن ضرب عضب کی کامیابیوں کو مستحکم کرنے کے لیے ملکی سطح کی انسداد دہشت گردی مہم تھی۔ حکومت نے پورے ملک میں دہشتگرد گروہوں کو کمزور کرنے اور عسکریت پسند تنظیموں کو بھرتیوں سے روکنے کے لیے بھی اقدامات کیے۔ مثال کے طور پر، قانون نافذ کرنے والے اداروں نے شہری علاقوں جیسے اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں ہتھیاروں کے بڑے ذخائر ضبط کیئے۔ پولیس نے کراچی میں جرائم کے گروہوں کے ممبران اور ٹی ٹی پی کے کمانڈروں کو گرفتار کیا، جو مبینہ طور پر قبائلی علاقوں میں عسکریت پسندوں کو لاجسٹکس سپورٹ فراہم کرتے تھے۔ پولیس نے بڑے شہروں میں ممکنہ خودکش حملہ آوروں کو گرفتار کر کے اسلحہ، خودکش جیکٹ اور منصوبہ بندی کا مواد ضبط کیا۔

نامکمل حفاظتی انتظامات، سیکورٹی فورسز اور عسکریت پسندوں دونوں جانب سے دھمکیوں، جبکہ حکومت اور سیکورٹی فورسز کی جانب سے باہر سے آنے والے افراد کی فاٹا تک رسائی پر پابندیوں نے انسانی حقوق کی تنظیموں کی فوجی زیادتیوں کے متاثرین کو سہولیات فراہم کرنے اور صحافیوں کی خبریں نشر کرنے کے کوششوں کو سبوتاژ کیا۔

کراچی میں سیاسی، فرقہ وارانہ، جرائم پیشہ اور لسانی تنازعہ جاری رہا لیکن تشدد میں کمی آئی اور جرائم پیشہ گروہوں کا اثر سیکیورٹی آپریشن سے پہلے کی بہ نسبت کم ہو گیا۔ ملک کے دوسرے حصوں میں قدرتی آفات اور فوجی آپریشن کے باعث پیدا ہونے والے عدم استحکام کی وجہ سے سندھی، بلوچ اور پشتون سمیت مختلف لسانی تشخص کے لوگوں کی کراچی کی طرف جاری ہجرت کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس رجحان کی وجہ سے سیاسی جماعتوں، لسانی اور فرقہ ورانہ گروہوں کے درمیان توازن میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ سیاسی جماعتیں اور ان سے وابستہ گروہ شہر پر سیاسی اور معاشی کنٹرول کے لیے لڑتے رہے، اور انہوں نے بھتہ خوری اور کچی آبادیوں پر استحقاق ملکیت کے لیے علاقے میدان جنگ بنا دیے۔

قتل وغارت: ایسی اطلاعات تھیں کہ سرکاری سیکورٹی فورسز نے شہریوں کی خونریزی کی اور عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن کے دوران ماورائے عدالت قتل میں ملوث رہیں۔ سیکیورٹی فورسز نے ملک بھر میں عسکریت پسندوں کو قتل کیا۔ ایسی بہت سی میڈیا رپورٹس تھیں کہ پولیس اور سیکیورٹی

فورسز نے مشتبہ دہشتگردوں کو "پولیس مقابلوں" میں مارا۔ کچھ مبصرین کا خیال تھا کہ سیکورٹی فورسز نے ان میں سے کچھ ہلاکتیں منصوبہ بندی کے تحت کروائیں۔

ٹی ٹی پی کے دھڑے جماعت الاحرار نے ۱۳ فروری کو لاہور میں پنجاب اسمبلی کے قریب ایک خودکش بم دھماکہ کی ذمہ داری قبول کی جس میں ۱۳ لوگ ہلاک اور 80 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ عسکریت پسند گروہ نے کہا کہ وہ حملہ حکومت، سیکورٹی فورسز، عدلیہ اور سیکولر سیاسی جماعتوں کے خلاف تشدد کی نئی مہم کا آغاز تھا۔

۲۴ جولائی کو لاہور میں ایک خودکش دھماکے میں کم از کم ۲۶ لوگ ہلاک اور 58 زخمی ہوئے۔ حکام نے بتایا کہ حملے میں پولیس اہلکاروں کے ایک گروپ کو نشانہ بنایا گیا۔ صوبائی حکام کے مطابق، ہلاک ہونے والوں میں سے کم از کم ۹ پولیس افسر تھے۔ ٹی ٹی پی نے دھماکے کی ذمہ داری قبول کی۔

آئی ایس ایس-کے نے بلوچستان اور سندھ میں کئی حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ ۱۷ فروری کو، "آئی ایس ایس-کے" نے سندھ میں لعل شہباز قلندر کے مزار پر خودکش دھماکہ کر کے کم از کم ۷۵ لوگوں کو قتل کرنے اور ۲۰۰ سے زائد دیگر افراد زخمی کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔

ملک بھر میں فرقہ وارانہ تشدد بھی جاری رہا۔ غیر سرکاری تنظیمیں فرقہ وارانہ تشدد کی تشریح پر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں، جو کہ حملوں اور اموات کی تعداد کی گنتی میں فرق کا باعث بنتا ہے۔ ایس اے ٹی پی کے مطابق، جنوری سے دسمبر تک ہونے والے ۱۵ فرقہ وارانہ حملوں میں ۲۲۹ افراد کی ہلاکت ہوئی، اس کی بہ نسبت ۲۰۱۶ء میں ۳۱ واقعات میں ۱۳۲ شہری ہلاک ہوئے۔ کرم ایجنسی، فاٹا کا واحد شیعہ اکثریتی علاقہ، تین الگ الگ بم دھماکوں کا نشانہ بنا، جن میں ۱۲۰ سے زائد افراد لقمہ اجل بنے۔ ۲۱ جنوری کو کرم ایجنسی کے دارالحکومت پاراچنار میں ایک سبزی منڈی میں بم دھماکہ ہوا جس میں ۲۵ شہری ہلاک ہوئے؛ لشکر جھنگوی اور ٹی ٹی پی نے ذمہ داری قبول کی۔ ۲۳ جون کو دو دھماکوں میں مرکزی پاراچنار کے توری مارکیٹ میں جڑواں دھماکوں میں ۷۲ شہری ہلاک ہوئے۔ لشکر جھنگوی نے حملے کا دعویٰ کیا۔ ۱۰ اکتوبر کو، بلوچستان میں ایک خودکش حملہ آور نے کم از کم ۲۴ عبادت گزاروں کو ہلاک کیا۔

احمدی کمیونٹی کے ایک سے زائد ارکان کو بظاہر نشانہ بنا کر مارا گیا۔ مارچ ۳۰، اپریل ۷ اور مئی ۳ کو نامعلوم مسلح افراد نے تین احمدیوں کو مختلف واقعات میں قتل کیا۔

اغواء: ایسی اطلاعات تھیں کہ عسکریت پسندوں نے فاٹا، کے پی، پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں شہریوں کو اغوا کیا یا پھر یرغمال بنایا۔ دولت اسلامیہ نے ۲۴ مئی کو کوئٹہ سے دو چینی شہریوں کے اغوا کی ذمہ داری قبول کی۔

جسمانی زیادتی، سزا اور تشدد: غیر ریاستی عسکریت پسند گروہوں نے جنگ میں حصہ نہ لینے والوں کو نشانہ بنایا اور پورے ملک میں بہت سے واقعات میں عام شہریوں کا قتل عام کیا گیا۔

کم عمر فوجی: غیر ریاستی عسکریت پسند گروہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کو اغوا کیا، اور والدین کو جھوٹے وعدوں پر جبری طور پر ۱۲ سال سے کم عمر تک بچوں کو دینے پر مجبور کیا جن کو جاسوسی، لڑائی، قتل و غارت اور خودکش بمبار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ عسکریت پسندوں نے بعض اوقات والدین کو پیسے دینے کی پیشکش کی، اکثر بچوں کو جنسی اور جسمانی زیادتی کا نشانہ بنایا اور نفسیاتی حربے استعمال کر کے بچوں کو قائل کیا کہ ان کی جانب سے کیے جانے والے عمل جائز تھے۔ حکومت نے سوات میں سابقہ بچہ فوجیوں کی بحالی اور تعلیم کیلئے ایک مرکز فعال کیا۔

تنازعہ سے وابستہ دیگر زیادتیاں: دہشتگرد گروہوں ٹی ٹی پی، لشکر جھنگوی اور وابستہ ٹولوں نے سرکاری عمارتوں پر بم دھماکے کیے، خواتین اساتذہ اور پولیو ورکرز پر حملے اور ان کو قتل کیا۔ سال کے دوران انسداد پولیو مہم سے وابستہ شعبہ صحت کے کارکنوں پر حملوں کے دو واقعات رپورٹ ہوئے۔ یہ دونوں واقعات کے پی میں ہوئے، پہلا ۲۴ مئی کو بنوں اور دوسرا ۲۱ جولائی کو پشاور میں۔ ٹی ٹی پی نے لڑکیوں کے سکولوں کو خاص طور پر نشانہ بنا کر بچیوں کی تعلیم سے نفرت کا اظہار کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ لڑکوں کے سکول بھی تباہ کیے۔ فوجی آپریشنوں نے عام شہری آبادیوں کیلئے اس وقت مسئلے پیدا کیے جب عسکریت پسندوں نے اہم راستے اور سرنگوں کو بند کر دیا یا مواصلات اور توانائی کے نیٹ ورک پر حملے کیے، تجارت میں خلل ڈالا اور کھانے اور پانی کی تقسیم میں رکاوٹ پیدا کی۔

حصہ دوئم۔ شہری آزادی کا احترام، بشمول:

(الف)۔ اظہار رائے کی آزادی، بشمول برائے پریس

قانون اظہار رائے اور پریس کیلئے آزادی فراہم کرتا ہے، لیکن آئینی پابندیاں موجود تھیں۔ اس کے ساتھ دھمکیوں، ہراسگی، تشدد اور قتل کے واقعات نے صحافیوں اور مدیران کو خود ساختہ سینسر شپ پر مجبور کیا۔

اظہار رائے کی آزادی: آئین اظہار رائے اور پریس کی آزادی کا حق فراہم کرتا ہے، ماسوائے ان معقول پابندیوں کے جو کہ قانون نے عظمت اسلام، پاکستان کی خود مختاری، سلامتی اور دفاع، بیرونی ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، پسندیدہ برتاؤ اور اخلاقی اقدار کے مفاد میں نافذ کی ہیں۔ قانون شہریوں کو حکومت پر کھلے عام یا ذاتی طور پر تنقید کا حق فراہم کرتا ہے لیکن فوج پر تنقید کے نتائج سیاسی اور مالی نوعیت کی کارروائی کی صورت میں

نکل سکتے ہیں۔ توہین رسالت کا قانون مذہب اور مذہبی نظریات کے بارے میں بات کرنے کی آزادی کو محدود کرتا ہے۔ حکومت نے کچھ تحریری اور تصویری مواد کو شر انگیز تقریر اور دہشتگردی کے زمرے میں لا کر پابندی نافذ کر دی۔

پریس اور ذرائع ابلاغ کی آزادی: آزاد ذرائع ابلاغ فعال تھے اور انہوں نے متنوع امور پر اظہار خیال کیا، صحافیوں نے اکثر حکومت کے سویلین حصہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ پریس نے مذہبی اقلیتوں کی قتل عام کا معاملہ اٹھایا۔ قانون کے مطابق حکومت قومی مفاد کے منافی کسی بھی معلومات تک رسائی روک سکتی ہے۔ سال کے دوران، حساس امور جیسے سول-ملٹری تنازعہ یا سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں پر رپورٹنگ کرنے والے صحافی دھمکیوں، ہراسگی اور تشدد کا شکار رہے۔

ملک میں ۴۵۵ غیر جانبدار انگریزی، اردو اور علاقائی زبانوں کے روزنامہ، ہفتہ وار اخبار اور جریدے موجود تھے۔ آزاد جموں کشمیر میں اشاعت کیلئے مالکان کو کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ وزارت اطلاعات و نشریات نے ملک کی اہم ترین وائر سروس ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کا انتظامی کنٹرول سنبھالے رکھا، جو کہ مقامی ذرائع ابلاغ کو سرکاری اور بین الاقوامی خبریں فراہم کرنے کا سرکاری ذریعہ ہے۔ فوج کے پاس اپنا میڈیا اور تعلقات عامہ کا دفتر، انٹر سروسز پبلک ریلیشن (آئی ایس پی آر) موجود تھا۔ حکومت کی ملکیت میں کام کرنے والے پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور پاکستان ٹیلی ویزن کارپوریشن نے ملک بھر میں ٹی وی پروگرامز کی نشریات جاری رکھی اور ریڈیو سٹیشن چلاتے رہے۔ فاٹا اور پاٹا میں حکام نے غیر سرکاری ریڈیو اسٹیشنز کو فاٹا سیکرٹریٹ کی اجازت سے نشریات چلانے کی اجازت دی۔

پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) نے ۸۹ مقامی نجی اور ۲۲ غیر ملکی ٹیلی ویژن چینلز کو نشریات کا لائسنس دیا، جن میں سے کافی حکومت پر تنقید کرتے ہیں۔ ملک میں ۱۴۳ کمرشل ایف ایم ریڈیو اسٹیشن موجود تھے مگر ان کے لائسنس کی شرائط میں خبروں والے پروگراموں کی نشریات کی ممانعت تھی۔ کچھ چینلز نے ٹاک شو فارمیٹ میں مباحثہ کرتے ہوئے اس پابندی کی خلاف ورزی کی۔ بین الاقوامی ریڈیو نشریات، بشمول بی بی سی، عام طور پر موجود رہیں۔ پیمرا نے بھارتی خبر رساں چینلز پر جولائی ۱۷ تک پابندی برقرار رکھی، جو کہ لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر اٹھائی گئی۔

پیمرا نے عدلیہ اور فوج پر تنقید پر پابندی لگا رکھی تھی، جیسا کہ آئین میں بھی اس پر روک ہے۔ سال کے دوران، پیمرا نے ٹی وی اسٹیشنز کو ادارتی ہدایات جاری کیں اور اپنے چیئرمین کو باختیار بنایا کہ پیمرا ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والے کسی بھی چینل کو بند کرنے کا حکم صادر کر سکتا ہے، خاص طور پر ایسے احتجاجی مظاہروں کو نشر کرنے کی وجہ سے جو فرقہ وارانہ فسادات کا باعث بن سکتے تھے۔ پیمرا نے ریڈیو مراکز پر بھارتی میڈیا کا مواد نشر کرنے پر پابندی بھی برقرار رکھی لیکن ذرائع ابلاغ کے مراکز نے اس پابندی کی پائمالی جاری رکھی، اور بہت سارے ایف ایم ریڈیو چینلز نے مشہور بھارتی نغمے نشر کیے۔

تشدد اور خوف وہراس: سیکورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں، عسکریت پسندوں اور دوسرے گروہوں نے ذرائع ابلاغ کے مراکز، صحافیوں اور ان کے خاندانوں کو تشدد اور ہراسگی کا نشانہ بنایا۔ خاص طور پر خواتین صحافی سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے جنسی تشدد اور ہراسگی کا شکار تھیں۔ سیکورٹی فورسز نے مبینہ طور پر صحافیوں کو اغوا کیا۔ جن ذرائع ابلاغ نے خود ساختہ سینسر شپ اختیار نہیں کی ان کو اکثر نتائج بھگتنا پڑے۔ اس کے علاوہ، دور دراز اور تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کو بنیادی ڈیجیٹل سیکورٹی اور روایتی حفاظتی مہارتوں کی معلومات کے فقدان کے باعث خود ساختہ سینسر شپ یا پھر خبر کو مکمل طور پر نشر نہ کرنے کے حوالے سے زیادہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹ کے مطابق ریاستی اور غیر ریاستی عناصر نے صحافیوں کو قتل، اغوا، ہراساں کیا اور ان پر جسمانی حملے کیے، دھمکایا اور دیگر طرح کے دباؤ کا نشانہ بنایا۔ کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹ (صحافیوں کے تحفظ کی کمیٹی) نے ملک کو اپنے "سزا سے بریت انڈیکس" میں شامل کیا کیونکہ حکومت نے پریس کے ممبران کے خلاف ہونے والے خونی تشدد کے ذمہ داراں کو بلا سزا کے جانے دیا۔

جنوری میں قلات، بلوچستان میں نامعلوم موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں نے روزنامہ قدرت اخبار کے محمد جان کو قتل کیا۔ ۹ جون کو لاہور کے روزنامہ ایکسپریس ٹریبیوں نے رپورٹ کیا کہ صحافی رانا تنویر نے ایک کار کی ٹکر میں ٹانگ گنوائی۔ ان کو مذہبی اقلیتوں کے بارے میں خبریں دینے پر ماضی میں نامعلوم ذرائع سے دھمکیاں ملتی رہیں۔ جون ۲۱ کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے نجی سیکورٹی گارڈز نے طالبعلموں سے متعلقہ واقعہ کی کوریج کیلئے پہنچنے والے سماء ٹی وی کے صحافیوں کو مار پیٹ کا نشانہ بنایا۔ صحافیوں کو اندر داخل ہونے سے روکا گیا لیکن وہ یونیورسٹی سے باہر رُک کر ویڈیو بنا رہے تھے تو گارڈز نے ان پر حملہ کیا۔ محافظوں نے ان صحافیوں پر بھی حملہ کیا جو اپنے ساتھی صحافیوں کی حمایت کیلئے بعد میں پہنچے۔ جون ۲۱ کو ہی اسلام آباد میں ایک مدرسہ کی جانب سے بجلی کی بظاہر چوری کی ویڈیو بنانے پر مدرسے کے طالبعلموں نے دن نیوز ٹیلی ویژن کے رپورٹر اور کیمرا مین کو مارا پیٹا اور پتھراؤ کیا۔

سینسر شپ یا مواد پر پابندیاں: چھوٹے اور نجی وائر سروسز اور میڈیا تنظیموں نے بتایا کہ انہوں نے عام طور پر خبریں نشر کرتے وقت، خاص طور پر فوج کے بارے میں رپورٹنگ کرتے ہوئے، بذات خود سینسر شپ اختیار کی۔ صحافیوں نے بتایا کہ ان کو اکثر اوقات تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں داخلہ کی سرکاری طور پر اجازت نہیں ملی یا تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں رپورٹنگ کیلئے فوج یا پھر عسکریت پسندوں کی زیر نگرانی دورہ کرنا پڑا، جس کا نتیجہ اس دباؤ کی صورت میں نکلتا تھا کہ حتمی مضمون فوج یا پھر عسکریت پسندوں دونوں میں سے کسی ایک کی طرف لچک رکھے گا، یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کس کے زیر نگرانی گئے تھے۔ باقی رپورٹنگ نسبتاً غیر جانبدارانہ رہی اور عمیق تجزیہ کی بجائے محض واقعات پر مرکوز رہی۔ عمیق تجزیہ کو صحافیوں نے اپنے لیے خطرناک قرار دیا۔ مبصرین کا خیال تھا کہ مسائل کے بارے میں لکھتے وقت غیر ملکی صحافیوں کو زیادہ خود مختاری حاصل تھی اور حکومت کی جانب سے چھان بین کا کم سامنا رہا۔ نجی کیبل اور سیٹلائیٹ چینلز نے بھی رپورٹ کیا کہ ان کو بہت سے مواقع پر اپنے اوپر خود ہی سینسر شپ لاگو کرنی پڑی۔ توہین رسالت اور احمدی مخالف قوانین نے بعض موضوعات پر اشاعت روک دی۔ غیر ملکی کتابوں کو دوبارہ اشاعت سے پہلے حکومت کے سینسر سے گزرنا پڑتا تھا، لیکن سال کے دوران کسی بھی کتاب پر پابندی کی اطلاع نہیں تھی۔ درآمد کی گئی کتابوں اور جرائد کو قابل اعتراض جنسی اور مذہبی

مواد کی چھان بین کا سامنا رہا۔ حکومت کی جانب سے وسیع پیمانے پر مقرر کردہ "بیہودہ ادب" کی تعریف کے زمرے میں میں آنے والا مواد قابل ضبطی تھا۔

حکومت نے ضابطہ اخلاق کی پائمالی اور ممنوعہ مواد اسکرین پر نشر کرنے والے ٹیلی ویژن چینلوں پر جرمانہ عائد کیا۔ فریڈم ہاؤس کے مطابق حکام نے میڈیا کو خاموش کرنے کیلئے پیمرا قوانین کو استعمال کرتے ہوئے لائسنس معطل یا معطل کرنے کی دھمکی دی۔

قومی سلامتی: کچھ صحافیوں نے بیان کیا کہ سرکاری پالیسیوں، فوج یا سرکاری افسران پر تنقید والے مواد کی ذرائع ابلاغ پر نشریات اور اس میں قطع برید کرنے کیلئے حکام نے قومی سلامتی کے تحفظ کے قوانین کا حوالہ دیا۔ ۲۰۱۵ء کے الیکٹرانک میڈیا (پروگرامز اینڈ ایڈورٹائزمنٹ) کوڈ آف کنڈکٹ میں کسی بھی ایسے علاقے کے بارے میں رپورٹنگ پر پابندی عائد کی گئی جہاں پر فوجی آپریشن جاری ہے۔

غیر سرکاری اثرات: عسکریت پسند اور جرائم پیشہ عناصر نے صحافیوں اور ان کے خاندانوں کو قتل، اغوا، مارپیٹ کی اور صحافیوں اور ان کے خاندانوں کو دھمکایا، جس کے باعث ان کو اپنی خبروں کو خود سینسر کرنا پڑا۔

انٹرنیٹ کی آزادی

۲۰۱۲ء سے حکومت نے غیر اسلامی، فحش مواد اور ریاست اور عسکری قوتوں پر تنقید کی روک تھام کے لیے باضابطہ طور پر قومی سطح پر مواد کی نگرانی اور چھان بین کا نظام نافذ کیا ہے۔ فریڈم ہاؤس کے مطابق حکومت نے ایسی پابندیوں کو سلامتی کے مقاصد کیلئے ضروری قرار دیا۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ حکومت نے کچھ انتہا پسند اور بلوچ آزادی کی وکالت کرنے والی ویب سائٹس کو بلاک یا کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

مواد کی نگرانی کے عمل میں شفافیت اور احتساب کا فقدان تھا اور حکومت نے بیشتر اوقات جائز طریقہ ہائے کار کے بغیر مبہم معیار استعمال کیا۔ فریڈم ان دی ورلڈ رپورٹ برائے ۲۰۱۷ء میں فریڈم ہاؤس نے دعویٰ کیا کہ ملک میں مبینہ طور پر غیر اسلامی، فحش اور توہین رسالت پر مبنی مواد رکھنے پر دو لاکھ (۲۰۱۶ء کی چار لاکھ سے کم) ویب سائٹس پر پابندی لگائی گئی۔ رپورٹ میں انٹرنیٹ کے استعمال پر حکومت کے پابندیوں والے قوانین کا حوالہ دیا گیا اور بیان کیا گیا کہ سول سوسائٹی کی تنظیموں کو سخت اقدامات کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت نے صحافیوں کی جانب سے بلوچ انسانی حقوق کے بارے میں چلائے جانے والے بلاگ تک رسائی بند کر دی۔ حکومت نے بے شمار بلوچ ویب سائٹس بشمول انگریزی زبان کے دی بلوچ حال اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے اخبار روزنامہ توار کی ویب سائٹ کو بند کیا۔

مارچ میں حکومت نے فیس بک اور ٹوئٹر کو درخواست دی کہ دنیا بھر میں موجود ایسے پاکستانیوں کی نشاندہی کی جائے جو اسلام کے خلاف توہین آمیز مواد پوسٹ کرنے میں ملوث ہیں تاکہ مقامی حُکام ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی یا توہین رسالت کے الزامات کی بنیاد پر ان کی ملک بدری کی کوشش کر سکیں، جس کا نتیجہ سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔

۱۰ جون کو انسداد دہشت گردی کی عدالت نے ۳۰ سالہ شیعہ نوجوان تیمور رضا کو فیس بک پر توہین آمیز پوسٹ لگانے پر سزائے موت سنائی۔ مبصرین کے مطابق یہ سوشل میڈیا پر توہین رسالت کا جُرم صادر کرنے پر خصوصی طور پر دی گئی پہلی سزائے موت تھی۔

حکومت نے Prevention of Electronics Crime Act 2016 (برقی ذرائع آلات پر جرائم کی روک تھام کا قانون) نافذ کیا، جس کے ناقدین کا دعویٰ ہے کہ یہ قانون جرم کے زمرے میں آنے والی یا ہٹائے جانے کے قابل قرار دیے جانے والی آن لائن تقریر کی وسیع اور مبہم تشریح پر مبنی تھا۔ ۲۵ جون کو کوئٹہ میں ایک صحافی کو مسلح افراد کی جانب سے اس کے گھر سے گرفتار کر کے وفاقی تحقیقاتی ادارے (آیف آئی اے) کے سپرد کیا گیا اور اس کے خلاف سوشل میڈیا پر "غیر قانونی مواد" رکھنے کے الزامات پر مذکورہ برقی ذرائع آلات پر جرائم کی روک تھام کے قانون کے تحت قانونی چارہ جوئی کی گئی۔ ڈیجیٹل رائیٹس کے موضوع پر کام کرنے والے کارکنوں نے اس قانون کی اظہار رائے کی آزادی، خاص طور پر سوشل میڈیا پر، قدغن لگانے والی صلاحیت پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اس قانون میں بیان کیا گیا کہ حکومت سائبر کرائمز کے حوالے سے خصوصی ٹربیونل قائم کرے گی، لیکن یہ غیر واضح رہا کہ عدالتیں اس بل کی کس طریقہ سے تشریح یا نفاذ کریں گی۔

دی الیکٹرانک ٹرانزیکشن ایکٹ اور دوسرے قوانین، الیکٹرانک میڈیا اور سسٹمز کے غلط استعمال اور اس قسم کی ڈیٹا کے دیگر جرائم میں استعمال ہونے کے حوالے سے بہت سے جرائم کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ ایکٹ بیان کرتا ہے کہ انٹرنیٹ پر پھلائی گئی دہشت کے ذریعے اگر کوئی موت ہو جائے تو ذمہ دار کو پھانسی یا عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) دور رس مواصلات کے قیام، فعالیت اور بحالی کی ذمہ دار ہے اور برقی مواصلات کے ذرائع پر مواد کی نشریات پر مکمل ضابطہ رکھتا ہے۔ پی ٹی اے کی جانب سے ورچوئل پرائیویٹ نیٹ ورکس (وی پی این) اور وائیس-اوور-انٹرنیٹ پروٹوکول (وی او آئی پی) پر ۲۰۱۱ء میں عائد کردہ پابندی کے باوجود سال کے اختتام تک وی پی این اور وی او آئی پی دونوں کے استعمال تک رسائی ممکن تھی۔

غیر سرکاری تنظیموں اور انٹرنیٹ کی آزادی پر کام کرنے والے مبصرین کے مطابق حکومت نے انسانی حقوق کے کارکنوں اور صحافیوں کی آن لائن نگرانی سخت کر دی، جس کا نتیجہ بے شمار سوشل میڈیا کارکنان کی گمشدگیوں کی صورت میں نکلا۔ مئی میں ایف آئی اے نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ وہ فوج

اور دوسرے اداروں کے خلاف منفی مواد پھلانے کے الزامات کے تحت ۲۰۰ سوشل میڈیا اکائونٹس کی تفتیش کر رہا ہے۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ حکومت نگرانی کا سافٹ ویئر استعمال کر رہی ہے۔

پی ٹی اے کے مطابق نومبر تک ملک میں لگ بھگ ۵۰ ملین براڈ بینڈ سبسکرائبرز (انٹرنیٹ صارفین) موجود تھے، جو کہ انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کا چوبیس اعشاریہ پانچ فیصد ہے۔

تعلیم و تدریس کی آزادی اور ثقافتی تہوار

حکومت نے عام طور پر تعلیمی آزادی کو محدود نہیں کیا لیکن ثقافتی تہواروں کی نگرانی اور سینسر شپ کی۔ فنون لطیفہ کی نمائشوں، موسیقی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت جاری رہی۔ اس قسم کے تہوار منعقد کرنے کے لیے حکومت سے پیشگی اجازت یا این او سی لینا لازمی ہوتا ہے۔ وزارت ثقافت کے زیر نگرانی چلنے والے مرکزی فلم سینسر زبورڈ نے غیر ملکی اور مقامی فلموں سے فحش مواد اور بھارتی ہیروز، رہنماؤں اور فوجی شخصیتوں کی تشہیر والے مواد کا جائزہ لیا اور اس کو ہذف کیا۔

(ب)۔ پرامن اجتماع اور تنظیم سازی کی آزادی

آئین اور قانون پُرامن اجتماع اور تنظیم سازی کی اجازت مہیا کرتا ہے مگر یہ آزادیاں پابندیوں کے ماتحت رہیں۔

پرامن اجتماع کی آزادی

قانون کے تحت ضلعی حُکام پولیس کی اجازت کے بغیر چار سے زیادہ افراد کے جمع ہونے پر پابندی لگا سکتے ہیں۔ قانون، حکومت کو جنازہ کے سوا ہر قسم کے ریلیوں اور جلوس پر سیکورٹی وجوہات کی بنا پر پابندی عائد کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

حُکام نے عام طور پر مذہبی اقلیت احمدیوں کو کانفرنسیں یا اجتماعات منعقد کرنے سے منع کیا۔ احمدیوں کے مطابق دسمبر ۲۰۱۶ء میں پنجاب پولیس کی جانب سے ربوہ مرکز پر چھاپا، کمیونٹی کو درپیش بدترین حالات کا ایک ثبوت ہے۔ مئی میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے چھاپے کے دوران گرفتار کیے گئے دو احمدیوں کو تین سال قید کی سزا سنائی۔

ملک بھر میں پُر امن اور پر تشدد دونوں قسم کے بہت سے احتجاج، ہڑتالیں اور مظاہرے واقع پذیر ہوئے۔ حکومت نے حفاظتی مجبوریوں کا حوالہ دیتے ہوئے اسلام آباد کے سفارتی علاقے اور سرکاری عمارتوں والے ریڈ زون میں سیاسی، سول سوسائٹی اور دوسری کسی بھی وابستگی والے گروہوں کو احتجاجی مظاہرے منعقد کرنے سے روکا۔

تنظیم سازی کی آزادی

آئین، ماسوائے چند قانونی پابندیوں کے، تنظیم سازی کی آزادی فراہم کرتا ہے۔ حکومت نے ایسی پالیسیوں کا سلسلہ برقرار رکھا جن کی بدولت بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں (آئی این جی اوز) کی امداد کی مستحق گروہوں تک رسائی کی آزادی رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ این جی اوز پر لازم ہے کہ وہ اپنے منصوبوں سے متعلق بہت ساری سرگرمیوں کے لیے حکومت سے این او سی کی صورت میں اجازت حاصل کریں۔ آئی این جی اوز، اقوام متحدہ کے اداروں، اور بین الاقوامی اداروں کو زیادہ تر اندرونِ ملک سفر یا منصوبہ شروع کرنے سے پہلے مذکورہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

۲۰۱۵ء میں، حکومت نے آئی این جی اوز کی رجسٹریشن کا نیا آن لائن نظام اختیار کیا۔ یہ طریقہ ہائے کار لمبی کاغذی کارروائیوں، مختلف سطح کے جائزوں، سیکیورٹی اداروں اور دیگر سرکاری دفتروں کی مستقل تفتیش پر مشتمل ہے۔ ۲۷ نومبر کو، حکومت نے کچھ مخصوص آئی این جی اوز کی رجسٹریشن کی منسوخی کے خطوط ارسال کیے۔ مراسلے کے اندر مخاطب شدہ آئی این جی اوز کو ۶۰ دن کے اندر کام بند کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ مراسلے میں اپیل کے طریقہ ہائے کار کے بارے میں معلومات پیش کی گئی تھی لیکن آئی این جی اوز کے مطابق وضع کی گئیں ہدایات اور پیمانہ بالکل مبہم تھا۔ ۱۵ دسمبر تک، کم از کم ۱۷ آئی این جی اوز کو رجسٹریشن کی منسوخی کا مراسلہ موصول ہوا۔ کچھ صوبوں میں رجسٹریشن کی منظوری کے ثبوت کے بغیر این او سی حاصل کرنا دشوار تھا جس کے باعث ترقیاتی کام اور سکی نگرانی کرنا دشوار بن گیا۔ حتیٰ کہ جن آئی این جی اوز نے رجسٹریشن کروانے کا مرحلہ شروع کر رکھا تھا انکو بھی اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ آئی این جی اوز کو انکے بین الاقوامی اسٹاف کی ویزا درخواستیں مسترد ہونے کے واقعات میں بھی اضافہ کا سامنا کرنا پڑا۔ رجسٹریشن کے طریقہ ہائے کار کی غیر یقینی کی وجہ سے کم از کم ایک آئی این جی او نے رجسٹریشن کے لیے دی گئی اپنی درخواست واپس لی اور ملک میں کام بند کر دیا۔

وفاقی اور صوبائی سطح پر حکومتوں نے اسی طرح بیرونی مالی امداد سے کام کرنے والی مقامی غیر سرکاری تنظیموں کی نقل و حرکت بھی ایک علیحدہ رجسٹریشن نظام، این او سی، اور دیگر تقاضوں کی بنیاد پر محدود کر دی۔ حکام نے این جی اوز سے مطالبہ کیا کہ کوئی بھی بیرونی امداد قبول کرنے، سہولیات کی بکنگ اور یونیورسٹیوں کے اندر پروگراموں یا حساس نوعیت کے انسانی حقوق کے امور پر کام کرنے سے پہلے عدم اعتراض کا تصدیق نامہ (این او سی) حاصل کریں۔ بیرونی امداد لینے والی این جی اوز کی باضابطہ رجسٹریشن ہونے کے باوجود ان کو سرٹیفیکٹ دینے سے انکار کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سارے ضروری دستاویزات پوری طرح سے موجود ہونے کے باوجود مقامی این جی اوز کو حکومت کی جانب سے ہراساں کیئے جانے کا عمل جاری رہا۔

(ج)۔ مذہبی آزادی

محکمہ خارجہ کی بین الاقوامی مذہبی آزادی کی رپورٹ ملاحظہ کیجئے:
www.state.gov/religiousfreedomreport/

(د)۔ نقل و حرکت کی آزادی

قانون اندرون ملک نقل و حرکت، سیاحتی سفر، ہجرت، اور وطن واپسی کی آزادی فراہم کرتا ہے، لیکن حکومت نے ان حقوق پر بھی حد بندی لگائی۔

حکومت نے اندرونی طور پر بیدخل ہونے والے افراد، پناہ گزینوں، واپس جانے والے پناہ گزینوں، پناہ مانگنے والوں، اور دوسرے آفت زدہ افراد کو تحفظ اور امداد فراہم کرنے کے لیے قوامِ متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزین کے دفتر اور دیگر انسانی امداد کی تنظیموں کے ساتھ تعاون کیا۔

مہاجروں، پناہ گزینوں اور بے وطن لوگوں کے حقوق کی پامالی: حکومت نے قانونی طور پر درج شدہ اور رہائش کا تصدیق نامہ یعنی پروف آف ریزیڈنس (پی او آر) کارڈ رکھنے والے ۱۴ لاکھ افغان مہاجرین کو عارضی قانونی حیثیت فراہم کی۔ فروری میں وفاقی کابینہ نے یہ فیصلے منظور کیے: (۱) پی او آر کارڈ کی دوبارا ایک سالہ مدت کی توسیع، جن میں سے پہلی ۳۱ دسمبر تک مؤثر ہو گی۔ (۲) افغان شہریوں کے لیے خصوصی ویزا درجہ بندیوں کا اجراء، مثال کے طور پر سرمایہ کاری، ہنر مند اور غیر ہنر مند مزدور، طالبعلم، میڈیکل اور شریک حیات کا ویزا بشمول شہریت حاصل کرنے کے امکانات۔ (۳) مہاجرین کے لیے قومی سطح کا قانون بنانے کی حمایت اور (۴) ملک میں درج ہونے سے رہ جانے والے افغان مہاجرین کی رجسٹریشن۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں چھ لاکھ افغان مہاجرین رہتے ہیں۔

صوبائی حکام، پولیس اور میزبان کمیونیٹیوں کی جانب سے افغان مہاجروں کو ہراساں کرنے اور بھتہ خوری کی رپورٹیں موجود تھیں۔ یو این ایچ سی آر نے رپورٹ کیا کہ جنوری سے اکتوبر تک، ۳۴۵، ۳ مہاجرین کی گرفتاری اور پکڑے جانے کے واقعات ہوئے۔ جو گرفتار ہوئے ان سب کو یو این ایچ سی آر یا اس کی شراکتدار تنظیموں کی مداخلت پر آزاد کیا گیا، جن میں سے ۷۶ فیصد پر کوئی الزام نہیں تھا۔ فروری میں گرفتاریوں کا سلسلہ بڑھ گیا اور اس ایک ماہ میں افغان مہاجرین کی ہونے والی گرفتاریاں کسی بھی مہینے میں افغانیوں کی گرفتاری کے سب سے زیادہ واقعات تھے۔ حراست میں لینے کے زیادہ تر واقعات رد الفساد جیسے سیکیورٹی آپریشن کی وجہ سے ہوئے جو کہ سال کے اول میں ہونے والے دہشتگرد حملوں کے بعد شروع کیا گیا تھا۔

اگرچہ ہراساں کرنے کے انفرادی واقعات جاری رہے لیکن اس سال کے دوران افغان پناہ گزینوں کی ہراسگی میں کمی بھی واقع ہوئی۔ ہراساں کرنے کے واقعات مقامی باشندوں کی جانب سے افغان پناہ گزینوں کی موجودگی کے خلاف عوامی احتجاج سے لے کر قانون نافذ کرنے والے حکام کی طرف سے ہراساں کرنے کی انفرادی کہانیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔

اندرونِ ملک نقل و حرکت: حکومت کی جانب سے اکثر سیکورٹی خدشات کی وجہ سے فاٹا، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے بعض علاقوں تک رسائی پر عائد پابندی کے باعث افراد کی نقل و حرکت کرنے کی آزادی میں رکاوٹ پڑی۔ حکومت نے ملک کے "حساس" قرار دیے گئے علاقوں کی طرف سفر کیلئے پیشگی اجازت نامہ کا حصول لازمی قرار دیا۔

بیرونِ ملک سفر: قانون اسرائیل کی جانب سفر کرنے سے منع کرتا ہے، اور ملک کے جاری کردہ پاسپورٹوں پر تحریر ہے کہ "یہ اسرائیل کے سوا تمام ممالک کے لیے مؤثر ہے"۔ حصولِ پاسپورٹ کے لیے درخواست دہندگان کو ان کی مذہبی وابستگی تحریر کرنی ہوتی ہے اور اگر درخواست دینے والا مسلمان ہو تو اس کو ایک حلفیہ اعلان کی تصدیق کرنے ہوتی ہے کہ احمدی تحریک کا بانی جھوٹا نبی تھا۔ احمدی نمائندوں نے بتایا کہ اگر انہوں نے اس حلف نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو ان کے پاسپورٹ پر لفظ "احمدی" تحریر کیا جاتا تھا۔ پالیسی کے مطابق، سرکاری ملازمین اور طالبعلموں کو بیرون ملک سفر کرنے سے پہلے حکومت سے این او سی حاصل کرنا لازمی ہے۔ تاہم، حکام نے طالبعلموں کے سفر پر اس شرط کو شاذ و نادر ہی نافذ کیا۔

حکومت نے ایگزٹ کنٹرول لسٹ (روانگی پر پابندی کی فہرست) میں شامل افراد کو ملک چھوڑنے سے روکا۔ اس فہرست کا مقصد ریاست مخالف سرگرمیوں اور دہشتگردی میں ملوث یا کالعدم تنظیموں سے وابستہ افراد اور اعلیٰ عدالتوں کے احکامات پر اس فہرست میں شامل کیے گئے افراد کو ملک چھوڑنے سے روکنا تھا۔ فہرست میں شامل لوگوں کو اپنا نام ہٹوانے کے لیے عدالت میں اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

جلاوطنی: سال کے دوران، حکومت نے یورپ سے بیدخل کیے گئے تارکین وطن کو واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ایک یورپی مشن نے رپورٹ کیا کہ بہت سے بیدخل کیے گئے افراد کو بیرون ملک قائم پاکستانی سفارتخانوں کی جانب سے جاری کردہ پاسپورٹ موجود ہونے کے باوجود ناقابل شناخت پاکستانی شہری قرار دیا گیا۔ کچھ غیر سرکاری اداروں نے رپورٹ کیا کہ حکومت نے اپنے بیرون ملک قائم سفارتی دفتروں سے پاسپورٹ وغیرہ جیسے قومی دستاویزات جاری کرنے پر سختی میں اضافہ کیا۔

اندرونی طور پر دربدر افراد (آئی ڈی پیز)

فاٹا میں عسکریت پسندانہ سرگرمیوں اور فوجی آپریشن کی وجہ سے بڑے پیمانے پر آبادی کی دربدری جاری رہی۔ ۲۰۰۸ء سے اب تک فاٹا کے ۵۳ لاکھ لوگ دردبدر ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ ایک سے زائد مرتبہ بے گھر ہوئے۔ اکتوبر کے اختتام تک، ان میں سے پچاس لاکھ افراد واپس آچکے تھے۔ حکومت اور اقوام متحدہ کی تنظیموں، مثال کے طور پر یو این ایچ سی آر، یونیسیف اور یو این ورلڈ فوڈ پروگرام (ڈبلیو ایف پی) نے تنازعہ سے متاثرہ افراد کی امداد کے لیے مشترکہ کوششیں کیں۔ نقل مکانی کے بعد آئی ڈی پیز کو بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگائے گئے، ان میں سے بہت سے بچوں کو پانچ سال میں پہلی مرتبہ یہ دوا میسر آئی۔ سرکاری اور امدادی اداروں نے انسداد پولیو مہم پر خصوصی زور دیا کیونکہ بہت سے بے گھر ہونے والے بچوں کو، انکے آبائی علاقوں میں طالبان کی جانب سے انسداد پولیو مہم پر نافذ کردہ پابندی کی وجہ سے، اس بیماری سے متاثر ہونے کے زیادہ خطرات لاحق تھے۔ انٹرنیشنل ڈسپلیسمینٹ مانیٹرنگ سینٹر کے مطابق کچھ علاقوں میں اندازے کے مطابق پچاس فیصد سے زائد آبادی پانچ سال یا اس سے زیادہ عرصہ دربدر رہی ہے۔ تنازعات کی وجہ سے بے گھر ہونے والے افراد نے میزبان خاندانوں، کرائے کی رہائشی سہولتوں یا، بہت کم تعداد میں، کیمپوں میں سکونت اختیار کی ہوئی تھی۔ لاتعداد بے گھر آبادیوں نے بڑے شہروں، مثال کے طور پر لاہور اور کراچی، کے باہر بستیوں میں رہائش اختیار کی۔

شمالی وزیرستان میں آپریشن ضرب عضب، خیبر ایجنسی میں آپریشن خیبر اول، دوئم، سوئم اور چہارم، اور دوسری عسکری سرگرمیوں کے باعث دربدر ہونے والے افراد کی واپسی جاری رہی۔ اقوام متحدہ کے رابطہ دفتر برائے انسانی امداد کے مطابق اکتوبر تک ۳۲۹،۰۱۲ خاندان فاٹا واپس آچکے تھے جبکہ ۴۶۹، ۳۲ خاندان ابھی تک دربدر تھے۔ اکتوبر ۲۰۱۵ء سے اب تک ۹۰ فیصد دربدر آبادی فاٹا کی طرف واپس آگئی تھی۔ ستمبر ۲۷ تک کے اعداد و شمار کے مطابق ۶۶ سے ۹۴ فیصد بے گھر افراد اپنے آبائی صوبے میں واپس آچکے تھے۔

فاٹا میں فوجی آپریشن کے دوران دربدر ہونے والے سول افراد کی مدد کی غرض سے جانے والی بین الاقوامی امدادی اداروں کے لیے لازمی تھا کہ فاٹا کی تمام ایجنسیوں میں رسائی کے لیے حکومت سے پیشگی اجازت نامہ حاصل کریں۔ انسانی امداد کے اداروں اور این جی اوز نے کہا کہ این او سی کے حصول کا طریقہ انتہائی دشوار تھا اور منصوبوں کو شروع ہونے میں قابل ذکر تاخیر کا سامنا رہا۔ انسانی امداد کے لئے کام کرنے والے اداروں کی جانب سے سکیورٹی خدشات کا اظہار کرنے کے باوجود حکومت نے آئی ڈی پی کیمپ فاٹا اور آس پاس ہونے والی فوجی کارروائی کے قریب برقرار رکھے۔ کیمپوں میں مدد فراہم کرنے والے انسانی امداد کے کارکنوں کو فاٹا کی طرف اور اندر سفر کرتے وقت خطرات کا سامنا تھا۔ اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں نے متاثرہ علاقوں اور کیمپوں تک رسائی زیادہ تر مقامی غیر سرکاری تنظیموں کے توسط سے برقرار رکھی۔

مہاجرین کے رضاکارانہ طور پر واپس جانے کے حوالے سے کوئی اطلاعات موجود نہیں تھیں۔ اطلاعات کے مطابق بنیادی ترقیاتی ڈھانچے، رہائشی اور شہری سہولیات کے فقدان، اور سرکاری اداروں کی جانب سے چیک پوسٹ کے ذریعے واپس آنے والوں پر سخت نگرانی کے باوجود، بہت سے دربدر

افراد اپنے گھروں کی طرف واپس جانے کے خواہشمند تھے۔ کچھ دربدر خاندانوں نے واپسی موخر کر دی یا خاندان کے چند افراد نے خیبر پختونخواہ کے ان آباد علاقوں کو رہنے کے لیے منتخب کیا جہاں پر صحت کی دیکھ بھال، تعلیم اور دوسری بنیادی سہولیات موجود تھیں۔ جو آئی ڈی پی واپس نہیں جا سکے، حکومت نے ان کی امداد کا بندوبست اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کی توسط سے کیا۔ ڈبلیو ایف پی نے خیبر پختونخواہ میں تنازعہ سے متاثرہ افراد میں ماہانہ کھانے کا راشن تقسیم کیا جبکہ فاٹا میں اپنے آبائی علاقوں میں واپس پہنچنے والے مہاجرین کے درمیان چھ مہینے کا راشن تقسیم کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

قدرتی آفات، دہشتگرد حملوں اور انسداد دہشتگردی کی کارروائیوں کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر افراد کی دربدری کے باوجود حکومت نے بے گھر ہونے والے لوگوں کے مسائل کے حل کے لیے کوئی بھی خصوصی قانون سازی نہیں کی۔ اس کے علاوہ نیشنل ڈزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ ۲۰۱۰ء بھی اندرون ملک بے گھر ہونے والوں اور انکے حقوق کے بارے میں کوئی بھی قانونی تشریح فراہم نہیں کرتا ہے۔

پناہ گزینوں کا تحفظ

پناہ گزینوں کی واپسی: ریفاؤلمینٹ یا پناہ گزینوں کی واپسی کی قانونی تشریح سے ملتے جلتے کسی بھی واقعے کے بارے میں اطلاع نہیں تھی۔

پناہ تک رسائی: قانون میں، پناہ دینے یا مہاجر ہونے کی حیثیت حاصل کرنے کے بارے میں کوئی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ ملک میں پناہ گزینوں اور ہجرت کرنے والوں کے انتظام وانصرام کے بارے میں قانون اور قوائد وضوابط پر مبنی ڈھانچے کا فقدان ہے۔ قانون پناہ مانگنے والوں اور مہاجرین کو غیر قانونی داخلہ اور رہائش کی شقوں سے بری نہیں کرتا۔ پناہ گزینوں کے بارے میں قومی قانونی ڈھانچے کی غیر موجودگی میں یو این ایچ سی آر نے اپنے مینڈیٹ کے تحت پناہ گزینوں کی حیثیت کا تعین کیا اور ملک نے عام طور پر یو این ایچ سی آر کے پناہ گزین کی حیثیت دینے والے فیصلے تسلیم کرتے ہوئے پناہ مانگنے والوں کو پناہ گزین کے طور پر قبول کیا اور ان کو کسی پائیدار حل کی تلاش تک ملک میں رہنے کی اجازت دی۔

روزگار: پناہ گزینوں کو قانونی طور پر کام کرنے کی اجازت کا کوئی باضابطہ دستاویزی اجازت نامہ رائج نہیں ہے، لیکن ملک میں پناہ گزینوں کو کام سے روکنے کا بھی کوئی قانون نافذ نہیں ہے۔ بہت سے مہاجرین عارضی بازاروں میں روزانہ اجرت پر مزدوری کرتے رہے اور مقامی آجروں نے غیر رسمی لیبر مارکیٹ میں کم یا بغیر اجرت کے کام کروا کر مہاجرین کی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا جبکہ خواتین اور بچے زیادہ مسائل کا شکار تھے ان کو کم تنخواہ یا نا پسندیدہ کام بھی قبول کرنا پڑے۔

بنیادی سہولیات تک رسائی: رجسٹر شدہ افغانوں کی ایک تہائی تعداد ۵۴ پناہ گزین دیہات میں رہتی ہے، جبکہ باقی دو تہائی شہری اور دیہاتی میزبان کمیونٹی میں رہتے ہیں اور بنیادی سہولیات بھی میزبان باشندوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ افغان مہاجرین پولیس اور عدالتوں کی خدمات حاصل کر سکتے تھے، لیکن ان میں سے کچھ، خاص طور پر غریب افراد، ایسا کرنے سے ڈرتے تھے۔ ایسی کوئی بھی اطلاعات نہیں تھی کہ مہاجرین کو ان کی قومیت کی وجہ سے صحت کی دیکھ بھال کی سہولت دینے سے انکار کیا گیا ہو۔

آئین ۵ سے ۱۶ سال کی عمر کے تمام بچوں کو ان کی قومیت کی تفریق کے بغیر مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مفروضہ یہ ہے کہ یو این ایچ سی آر اور سرکاری کمیشنریٹ برائے افغان مہاجرین کے ساتھ رجسٹرڈ ہر مہاجر بچہ، مناسب کاغذی کارروائی پوری کرنے کے بعد سرکاری تعلیمی مراکز میں داخل تھا۔ عملی طور پر اسکولوں میں داخلہ پرنسپل کی تعین کردہ خالی آسامی کی بنیاد پر منحصر تھا اور زیادہ تر رجسٹرڈ افغانی نجی افغان اسکولوں اور بین الاقوامی برادری کی اعانت سے چلنے والے تعلیمی اداروں میں داخل تھے۔ بڑی عمر کے طالب علموں، خاص طور پر پناہ گزین دیہاتوں میں موجود لڑکیوں کے لئے حصول تعلیم تک رسائی بہت مشکل تھی۔ وہ افغان جو پاکستان میں پلے بڑھے، ان کو یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لئے اسٹوڈنٹ ویزا درکار تھا، لیکن وہ اپنے مستقل رہائشی کارڈ کی بنیاد پر ویزا کے لیے اہل قرار پائے۔ افغان طالبعلم پاکستانی سرکاری اور نجی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کرنے کے اہل تھے۔

پائیدار حل: حکومت نے دیگر ممالک سے پناہ گزین دوبارہ رہائش کے لئے قبول کیے اور نہ ہی ان کے مقامی آبادی میں انضمام میں مدد فراہم کی۔ حکومت افغان مہاجرین کو پاکستانی شہریت نہیں دیتی۔

ریاستی اور سرحدی امور کی وزارت اور وزارت داخلہ کی نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کے درمیان ۱۱ مئی کو افغان باشندوں کی رجسٹریشن کے لیے مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط ہوئے۔ مفاہمت کے تحت، غیر رجسٹر افغانوں کی اکثریت والے علاقوں میں ۲۱ دستاویزاتی مراکز قائم کیے گئے۔ مفاہمت کے تحت نادرا نے افغانوں کو ۶ مہینے کے عرصے میں افغان سٹیزن کارڈ (اے سی سی) کے نام سے نئے شناختی کارڈ جاری کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ یو این سی ایچ آر کے مطابق اے سی سی نے غیر رجسٹر شدہ افغانوں کو جبری گرفتاریوں، حراست اور فارنرز ایکٹ کے تحت ملک بدری سے تحفظ دیا اور کارڈ افغانوں کو عارضی طور پر پاکستان میں رہنے کی اجازت فراہم کرے گا۔ اگر کارڈ رکھنے والے ملک چھوڑتے ہیں تو ان کو اپنی اس حیثیت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ جنوری ۲۰۱۸ء کے اختتام تک، مذکورہ ڈاکیومینٹیشن کا عرصہ ختم ہوا چاہتا تھا، جس کے بعد فقط موجودہ اے سی سی کارڈ ہولڈرز کے ہاں ہونے والے بچوں کا ریکارڈ داخل کیا جائے گا۔ رجسٹریشن کی مدت کے بعد ملک میں موجود غیر رجسٹرڈ افغانوں کو فارنرز ایکٹ کے تحت گرفتاری اور ملک بدری کا خطرہ لاحق ہو گا۔

بے وطن افراد

بے وطنی ایک بڑا مسئلہ بنی رہی۔ بے وطنی کے بارے میں کوئی بھی قانون سازی موجود نہیں ہے اور حکومت بے وطن افراد کے وجود سے انکاری ہے۔ بین الاقوامی اور قومی اداروں کے اندازے کے مطابق ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے بالترتیب، پاکستان۔ بھارت اور پاکستان۔ بنگلا دیش تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے ہزاروں بے وطن لوگوں کی ملک میں موجودگی کے امکانات تھے۔ اس کے علاوہ یو این ایچ سی آر نے اندازہ لگایا کہ ملک میں تین لاکھ روہنگیا باشندے رہائش پذیر تھے، جن کی بڑی تعداد کے بارے میں بے وطن ہونے کا گمان ہے۔

حصہ سوئم: سیاسی عمل میں شرکت کی آزادی

آئین شہریوں کی اکثریت کو غیر جانبدار اور منصفانہ خفیہ ووٹ کے ذریعے انتخابات میں اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کا حق دیتا ہے، جو کہ عام اور مساوی رائے دہی کے حقوق کے عین مطابق ہے۔ گلگت بلتستان، آزاد جموں و کشمیر، فاٹا اور پاٹا میں ملک کے باقی علاقوں سے مختلف سیاسی نظام نافذ ہیں۔ فاٹا اور پاٹا کو قومی پارلیمینٹ میں نمائندگی حاصل ہے، جب کہ گلگت بلتستان اور کشمیر کو نہیں۔
پارلیمینٹ میں نمائندگی ہونے کے باوجود فاٹا کے رہائشیوں کو قبائلی علاقہ جات کے بارے میں ہونے والے فیصلوں میں کوئی شنوائی نہیں اور فاٹا کے بارے میں اختیارات صدرِ مملکت کے پاس ہیں۔ قبائلی علاقوں کے عوام کو اپنی مقامی حکومت تبدیل کرنے کا حق حاصل نہیں، کیوں کہ غیر منتخب سویلین افسر قبائلی ایجنسیوں کو عمومی طور پر ۱۹۰۱ء کے ایف سی آر (۲۰۱۱ء میں ترمیم شدہ) کے تحت چلاتے ہیں۔ فاٹا میں کبھی بھی مقامی حکومتوں کے انتخابات نہیں ہوئے، حالانکہ ملک کے باقی صوبوں نے اپنے مقامی نمائندوں کا انتخاب کیا ہے۔ پولیٹیکل پارٹیز آرڈر ۲۰۰۲ء کی ۲۰۱۱ء میں فاٹا تک توسیع کے ذریعے حکومت نے سیاسی جماعتوں کو فاٹا میں آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت دی۔ سیاسی مبصرین نے اس حکم نامہ کو سراہتے ہوئے قبائلی ایجنسیوں میں مزید مضبوط سیاسی نظام کا سنگ بنیاد قرار دیا اور فاٹا کے "کے پی" صوبے میں ممکنہ انضمام اور اس کی انتظامیہ کو معمول پر لانے پر اندرونی بحث جاری رہی۔

آزاد جموں کشمیر کے پاس عبوری آئین، یک ایوانی منتخب اسمبلی، وزیر اعظم اور اسمبلی سے منتخب شدہ صدر موجود ہے۔ ۲۰۱۶ء میں اے جے کے نے قانون ساز اسمبلی انتخابات منعقد کیے جن کے نتیجہ میں پاکستان مسلم لیگ نواز کی اکثریتی حکومت بنی۔ ذرائع ابلاغ نے رپورٹیں دی کہ مقامی مبصرین نے بیان کیا کہ انتخابات بڑی پیمانے پر پُرامن اور دھاندلی کے الزامات سے بری تھے۔ اے جے کے الیکشن کمیشن نے امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے اضافی ۳۲ ہزار قانون نافذ کرنے والے اہلکار تعینات کیے۔ کچھ کشمیری سیاسی رہنماؤں نے انتخابات کے دن اضافی فوجی موجودگی کا ذکر کیا۔ وفاقی حکومت نے، بشمول فوج، اے جے کے حکومت اور اس کی انتخابی سیاست پر اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھا۔ جو افراد آزاد جموں و کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت نہیں کرتے، حکومت نے ان کو سیاسی عمل، سرکاری نوکریوں اور تعلیمی اداروں سے دُور رکھا۔

انتخابات اور سیاسی شرکت

حالیہ انتخابات: ۲۰۱۳ء میں ملک میں قومی انتخابات منعقد ہوئے جن کے نتیجے میں وزیر اعظم نواز شریف کی قیادت میں پی ایم ایل این کی اکثریتی حکومت وجود میں آئی۔ ۲۰۱۳ء میں ممنون حسین نے آصف علی زرداری سے صدارتی قلمدان لیا۔ ۲۸ جولائی کو سپریم کورٹ نے بدعنوانی کے الزامات پر نواز شریف کو نااہل قرار دیا۔ مجلس شوریٰ نے یکم اگست کو شاہد خاقان عباسی کو نیا وزیر اعظم منتخب کیا۔ آصف علی زرداری نے اپنی پانچ سالہ صدارتی مدت ۲۰۱۳ء میں مکمل کی اور ممنون حسین نے ان کے بعد عہدہ سنبھالا۔ آئین کے آرٹیکل ۴۱ کے مطابق الیکٹورل کالج (پارلیمینٹ کے دونوں مجالس اور صوبائی اسمبلیوں پر مشتمل) خفیہ رائے دہی کے ذریعے صدر مملکت کا انتخاب ایک خصوصی اجلاس کے دوران کرتا ہے جو کہ حاضر صدر کی پانچ سالہ مدت ختم ہونے سے ۳۰ سے ۶۰ دن قبل منعقد کیا جاتا ہے۔

گزشتہ انتخابات ۲۰۱۳ء میں الیکشن کمیشن آف پاکستان نے لگ بھگ ۴۳،۰۰۰ مقامی مبصرین کو تعینات کیا، جن میں سے اکثریت کا تعلق فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک (فافن) سے تھا۔ یورپی یونین، ڈیموکریسی انٹرنیشنل، عورت فاؤنڈیشن اور نیشنل ڈیموکریٹک انسٹیٹیوٹ بھی بہت سارے الیکشن مبصرین میں شامل تھے۔ حکومت نے موجودہ ساری جماعتوں کو انتخابات لڑنے کی اجازت دی، اگرچہ متعدد چھوٹی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔ دہشتگرد حملوں اور بعض ضابطے کے مسائل کے باوجود الیکشن مبصرین نے انتخابات کو کامیابی قرار دیا۔

سیاسی جماعتیں اور سیاسی شمولیت: سیاسی جماعتوں پر کچھ پابندیاں عائد تھیں۔ اکثر علاقوں میں اجتماع کرنے، انتخابات میں حصہ لینے، ووٹ حاصل کرنے یا عوامی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی مداخلت نہیں تھی۔ بلوچستان میں، اگرچہ رپورٹیں تھی کہ سیکیورٹی ایجنسیوں اور علیحدگی پسند گروپوں نے مقامی سیاسی تنظیموں، مثال کے طور پر بلوچستان نیشنل پارٹی اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو ہراساں کیا۔

خواتین اور مذہبی اقلیتوں کی شرکت: اگرچہ ملک میں عورتوں کو ووٹنگ سے روکنے کا کوئی بھی قانون رائج نہیں، لیکن قبائلی اور دیہی علاقوں میں رائج روایتی اور ثقافتی رکاوٹوں نے کچھ عورتوں کو ووٹنگ میں حصہ لینے سے دُور رکھا۔ حکام نے منتخب اداروں میں عورتوں کی کم از کم موجودگی یقینی بنانے کے لیے وسیع طور پر کوٹا سسٹم کا استعمال کیا۔ قومی اسمبلی میں عورتوں کے لیے مخصوص ۶۰ نشستیں ہیں۔ حکام نے ان نشستوں کو ہر پارٹی کی جانب سے الیکشن لڑ کر کامیاب ہونے والے امیدوار کی جانب سے حاصل کیے گئے ووٹوں کی بنیاد پر تقسیم کیا۔ حکام نے صوبائی اسمبلی کی ۷۵۸ میں سے ۱۲۹ سیٹیں خواتین کے لئے مختص کیں اور مقامی کونسلوں میں ایک تہائی نشستیں فراہم کیں۔ خواتین نے بطور سیاسی کارکن سرگرم کردار ادا کیا لیکن وہ سیاسی جماعتوں میں سوائے خواتین ونگ کے زیادہ تر قائدانہ عہدے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہیں۔ خواتین نے وفاقی کابینہ میں بھی خدمات سرانجام دیں۔

دو اکتوبر کو پاس ہو کر آٹھ پرانے قوانین کو تبدیل کرنے والے جامع "انتخابات ایکٹ ۲۰۱۷ء" میں خواتین، مذہبی اقلیتوں، خواجہ سراؤں اور معذور افراد کی انتخابی عمل میں شرکت میں اضافے کے لیے خصوصی اقدامات پر زور دیا گیا ہے۔ نئے قانون کے تحت پارٹی کے ۵ فیصد ٹکٹ لازمی طور پر خواتین کو دیے جائیں اور اگر کسی حلقہ میں ۱۰ فیصد سے کم خواتین ووٹ ڈالتی ہیں تو یہ تصور کیا جائے گا کہ عورتوں کے ووٹ کو دبایا گیا ہے اور اس حلقے یا پولنگ اسٹیشن کے نتائج منسوخ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ قانون معذور افراد کو ڈاک کے ذریعے ووٹ کا حق فراہم کرتا ہے۔ یہ غیر مسلم، خواجہ سراؤں اور معذوروں کو قومی شناختی کارڈ (جو ووٹر کی شناخت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے) کے جلد از جلد اجراء پر زور دیتا ہے۔

حکومت ووٹروں پر لازمی قرار دیتی ہے کہ ووٹ اندراج کراتے وقت اپنا مذہب ظاہر کریں اور احمدیوں کے لیے لازمی ہے کہ خود کو غیر مسلم قرار دیں۔ احمدی خود کو مسلمان سمجھتے ہیں اور ان میں سے بہت سارے مذکورہ قانون سے اتفاق نہ کرنے کی وجہ سے ووٹ دینے سے رہ گئے۔

حکومت کی جانب "غیر مسلم" تشریح کیے گئے مذہبی اقلیتوں کے لئے آئین نے سینٹ میں چار نشستیں یعنی ہر صوبہ میں سے ایک مختص کی ہیں۔ یہ نشستیں صوبائی اسمبلیوں میں منعقد ہونے والے بالواسطہ انتخابات کے ذریعے پُر کی جاتی ہیں۔ قومی اسمبلی کی دس نشستیں مذہبی اقلیتوں کے لیے مختص ہیں۔ حکام نے یہ نشستیں سیاسی جماعتوں کے درمیان قومی اسمبلی میں ان کی جانب سے جیتی گئی سیٹ کی شرح کے حساب سے تقسیم کیں۔ اقلیتوں کے پاس صوبائی اسمبلیوں میں ۲۲ مخصوص نشستیں تھیں: پنجاب میں ۸، سندھ میں ۹، کے پی میں ۲ اور بلوچستان میں ۳۔ مذہبی اقلیتی برادری کے کچھ ارکان نے اقلیتوں کی نمائندگی کے اس نظام پر تنقید کی، جس میں اقلیتی نمائندے صوبائی اور وفاقی سطح پر ان کی سیاسی جماعتوں کے جانب سے مخصوص سیٹوں پر مقرر کئے جاتے ہیں، ان کا کہنا تھا کہ اس نظام میں منتخب افراد اقلیتی برادری کے بجائے اپنی سیاسی جماعت کے مفادات کے لئے کام کرتے ہیں۔

خواتین اور اقلیتیں غیر مختص نشستوں پر بھی انتخاب لڑ سکتے ہیں۔

حصہ چہارم: حکومت میں بدعنوانی اور شفافیت کی کمی

قانون بدعنوان افسران کے خلاف فوجداری سزاؤں پر زور دیتا ہے، لیکن حکومت نے عام طور پر اس قانون کو مؤثر طریقے سے نافذ نہیں کیا اور سرکاری اہلکار اکثر و بیشتر بدعنوانی کے عمل میں ملوث رہے۔ گزشتہ سالوں کی طرح سیاست اور حکومت میں کرپشن چھائی ہوئی تھی اور مختلف سیاستدانوں اور سرکاری عہدے رکھنے والوں کو کرپشن کے الزامات کا سامنا تھا، بشمول رشوت خوری، بھتہ خوری، نااہل اقرباء پروری اور ساتھیوں پر بے جا نوازشات، جرائم کی سرپرستی، دھوکہ دہی اور خورد بُرد۔

بدعنوانی: سپریم کورٹ نے نومبر ۲۰۱۶ء میں وزیر اعظم نواز شریف اور ان کے خاندان کے افراد کے خلاف لگائے گئے کرپشن کے الزامات کی تفتیش کے لیے خصوصی بینچ تشکیل دیا۔ یہ الزامات ۲۰۱۶ء کے "پانامہ پیپرز لیکس" کی بنیاد پر لگائے گئے، جن میں انٹرنیشنل کنسورشیم آف انویسٹیگیٹو جرنلسٹس نے بیرونی ملک بینک اکاؤنٹس رکھنے والے پاکستانیوں کے نام شائع کئے۔ ۲۸ جولائی کو سپریم کورٹ نے اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کو قومی اسمبلی کی نشست سے نااہل قرار دے دیا۔ جس پر دوسرے دن انہوں نے بطور وزیر اعظم مستعفی ہو گئے۔ عدالت نے قومی احتساب بیورو کو وزیر اعظم، ان کے خاندان اور وزیر خزانہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حکم دیا۔ قومی احتساب عدالت کے سامنے مقدمہ ستمبر میں شروع ہوا اور سال کے آخر تک جاری رہا۔

نیب انسدادِ بدعنوانی کے اعلیٰ ترین ادارے کے طور خدمات سرانجام دیتا ہے، جس کا مینڈیٹ آگہی، روک تھام اور نفاذ قانون کے ذریعے کرپشن کا خاتمہ کرنا ہے۔ نیب اور دوسرے تفتیشی ادارے بشمول فیڈرل بورڈ آف ریوینیو، بینک دولت پاکستان اور فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) کرپشن، ٹیکس چوری اور منی لانڈرنگ کے جرائم کی تحقیقات کرتے ہیں۔

پولیس فورس میں نچلی سطح پر کرپشن عام تھی۔ کچھ پولیس والوں نے حقیقی شکایتیں درج کرنے کے لیے پیسے وصول کیے جبکہ جھوٹی شکایتیں درج کرنے کے لیے بھی رشوت قبول کی۔ الزامات سے بچنے کے لیے رشوت دینا معمول تھا۔

عدالتی نظام میں عملے کی جانب سے چھوٹے پیمانے پر سہولتوں کی فراہمی کے لیے ادائگیوں کے مطالبے سمیت، کرپشن کی زبانی رپورٹیں موجود تھیں۔ ماتحت عدالتیں مبینہ طور پر کرپٹ، نااہل رہیں اور اعلیٰ ججوں، مشہور لوگوں و دولت مندوں، مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کے دباؤ کا شکار تھیں۔

اثاثہ جات ظاہر کرنا: قانون کے مطابق پارلیمینٹ کے ارکان، سرکاری ملازمین اور وزراء اپنے اثاثے ظاہر کرنے کے پابند ہیں۔ منتخب عہدیدار اپنی بیویوں اور زیر کفالت بچوں کے اثاثے بھی ضرور ظاہر کریں۔ ان معلومات کو ظاہر کرنے میں ناکامی ان کی سرکاری عہدے سے پانچ سال کے لیے نااہلی پر منتج ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، سربراہ مملکت اپنی آمدن اور اثاثے ظاہر کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ ججوں، جرنیلوں اور اعلیٰ افسران کے اثاثے اکثر اوقات عوام سے پوشیدہ تھے۔

سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اثاثے اور واجب الادا قرضے ظاہر کر کے اپنی سالانہ مالی کھاتہ رپورٹیں جمع کرائیں۔ یہ قانون مکمل طور پر نافذ نہیں تھا اور بہت سے قانون سازوں نے عام طور پر اس کو نظر انداز کیا۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کی اس بات کو یقینی بنانا ذمہ داری ہے کہ سیاسی جماعتوں اور سیاستدان اپنے مالی معاملات کی معلومات عوام کے سامنے پیش کریں، الیکشن کمیشن پارلیمینٹ ارکان کے اثاثوں کی سالانہ فہرست شائع کرتا ہے۔

اگر کسی افسر پر بد عنوانی اور مالی بے ضابطگیوں کا الزام ہو تو اس کو انضباطی کارروائی کے قوانین کے تحت تفتیش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بد عنوانی کا مرتکب افسر ۱۴ سال قید، جرمانہ، یا دونوں سزائیں پا سکتا ہے اور حکومت کرپشن کے ذرائع سے بنائی گئی جائداد ضبط کر سکتی ہے۔

حصہ پنجم: انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی بین الاقوامی اور غیر سرکاری تفتیش کے حوالے سے حکومتی رویہ

اگرچہ کچھ مقامی اور بین الاقوامی انسانی حقوق کے گروپس نمایاں حکومتی پابندیوں کے بغیر کام، تحقیق اور انسانی حقوق کے واقعات پر اپنی تفتیش شائع کرتے رہے، لیکن حکومت نے این جی اوز کی کام کرنے کی صلاحیت بڑی حد تک محدود کر دی۔ کچھ گروپس جنہوں نے حکومت، فوج یا خفیہ اداروں کو غلط کاموں میں ملوث قرار دیا یا جو آئی ڈی پیز، تنازعہ سے متاثرہ علاقوں یا ایڈووکیسی پر کام کر رہے تھے انہوں نے بتایا کہ حکومت نے ان کے کام کرنے کی صلاحیت کو محدود کر دیا۔ ان گروپوں نے اپنے سفر، ویزا اور رجسٹریشن کے حوالے سے بیشمار انتظامی کارروایوں کا سامنا کیا، جس کے باعث ان کے پروگرام اور امداد جمع کرنے کی کوششوں کو نقصان پہنچا۔ خود کو رجسٹر کروانے میں کامیاب ہونے والی آئی این جی اوز سمیت تنظیموں کے بین الاقوامی اسٹاف کو ویزا اور اندرون ملک سفر کے لئے این او سی حاصل کرنے میں تاخیر یا انکار کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی این جی اوز کے حکومت کے ساتھ رجسٹریشن معاہدے نے این جی اوز کو پابند کیا ہے کہ وہ "متنازعہ الفاظ جیسا کہ امن اور تنازعات کا حل، آئی ڈی پیز وغیرہ اپنی سالانہ رپورٹوں یا دیگر دستاویزات، خط و کتابت اور معاہدوں میں استعمال نہیں کریں گے"۔ بہت کم این جی اوز کو کے پی، فاٹا اور بلوچستان کے مخصوص علاقوں تک رسائی حاصل رہی۔

انسانی حقوق کے سرکاری ادارے: ۲۰۱۲ء کے نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس بل نے ایک خود مختار کمیٹی - نیشنل کمیشن آن ہیومن رائیٹس - کے قیام کا اختیار دیا اور ۲۰۱۵ء میں ایک خود مختار وزارت انسانی حقوق دوبارہ بنائی گئی۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کی قانون، انصاف، اقلیتوں اور انسانی حقوق کے بارے میں اسٹینڈنگ کمیٹیوں نے غیرت کے نام پر جرائم، توہین رسالت قانون اور حدود آرڈیننس سے متعلقہ مقدمات میں پولیس کی زیادتیوں سمیت بڑے پیمانہ پر انسانی حقوق کے مسائل کے بارے میں سماعت کی۔

حصہ ششم: تفریق، معاشرتی زیادتیاں اور انسانی اسمگلنگ

خواتین

جنسی زیادتی اور گھریلو تشدد: جنسی زیادتی ایک سنگین جرم ہے جس کی پاداش میں دس سے پچیس سالہ قید، جرمانہ اور پھانسی کی سزا شامل ہے۔ اجتماعی زیادتی کی سزا پھانسی یا عمر قید ہے۔ اگرچہ جنسی زیادتی کے واقعات بار بار ہوتے رہے، لیکن مقدمہ شاذ و نادر ہی درج ہوا۔ شریکِ حیات کے ساتھ جنسی

زیادتی جرم میں شمار نہیں ہوتی۔ ۲۰۱۶ء میں پارلیمینٹ نے جنسی زیادتی کی روک تھام کا نیا قانون پاس کیا، جس میں ڈی این اے حاصل کرنے اور جنسی زیادتی کے متاثر فرد کا نام ظاہر نہ کرنے، متاثرہ فریق کو قانونی مدد حاصل کرنے کا حق، جبکہ ذہنی اور جسمانی طور پر معذور افراد کے ساتھ زیادتی پر مزید سخت سزائیں تجویز کی گئیں۔

گزشتہ سالوں کے دوران حکومت نے ویمن پروٹیکشن ایکٹ ۲۰۰۶ء (خواتین کے تحفظ کا قانون) مؤثر طریقے سے نافذ نہیں کیا۔ اس ایکٹ کی توسط سے جنسی زیادتی کے جرم کو اسلامی عدالت کے بجائے فوجداری عدالتوں کے تحت لایا گیا۔ قانون کے مطابق پولیس کسی متاثرہ خاتون کو دیوانی عدالت کے جج کی اجازت کے بغیر رات بھر تھانے میں نہیں رکھ سکتی۔ قانون متاثرہ فریق کو حق دیتا ہے کہ وہ براہ راست سیشن کورٹ میں شکایت کرے جو کہ سنگین جرائم کے مقدمات کی سماعت کرتی ہے۔ متاثرہ فریق کا بیان ریکارڈ کرنے کے بعد سیشن کورٹ کا جج سرکاری طور پر شکایت درج کرتا ہے جس کے بعد پولیس گرفتاریاں عمل میں لا سکتی ہے۔ این جی اوز نے رپورٹ کیا کہ اس طریقہ ہائے کار نے جنسی زیادتی کے ان متاثرین کے لئے رکاوٹیں پیدا کیں، جو عدالت کی طرف سفر یا رسائی حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جنسی زیادتی ایک ایسا جرم رہا جس کی بہت کم اطلاع دی گئی۔

۲۰۱۶ء میں پنجاب کی صوبائی حکومت نے پنجاب پروٹیکشن آف ویمن اگینسٹ وائیولینس (خواتین کا تشدد سے تحفظ) ایکٹ پاس کر کے گھریلو تشدد کے متاثرین کو زیادہ قانونی تحفظ، بشمول عدالتی حفاظتی احکامات اور ضلع سطح کے نئے دارالامان تک رسائی فراہم کی، جن میں سے سب سے پہلا مارچ میں ملتان میں شروع کیا گیا۔ یہ مرکز خواتین کو بہت ساری خدمات فراہم کرتا ہے، بشمول ان کے خلاف صادر ہونے والے جرائم کی ایف آئی آر کی تکمیل، بنیادی طبی امداد، طبی معائنہ، بعد از صدمہ بحالی، مفت قانونی اعانت اور دارالامان۔

کم اطلاع دیئے جانے کی وجہ سے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے اعداد و شمار جمع کرنے کے مرکزی نظام کی عدم دستیابی کی وجہ سے، جنسی زیادتی کے واقعات کے بارے میں کوئی بھی قابل اعتماد اعداد و شمار قومی، صوبائی اور مقامی سطح پر دستیاب نہیں تھے۔

عورت فاؤنڈیشن اور دیگر کے مطابق، رپورٹ شدہ جنسی زیادتی کے واقعات میں قانونی کارروائی کبھی کبھار ہوئی۔ پولیس اور این جی اوز کے مطابق، دیگر تنازعات میں ملوث افراد نے بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف جنسی زیادتی کے جھوٹے مقدمات دائر کیے، جس سے پولیس کی سچے واقعات کی نشاندہی کر کے قانونی چارہ جوئی کی صلاحیت متاثر ہوئی۔ این جی اوز نے بتایا کہ بعض اوقات پولیس بھی جنسی زیادتی کے واقعات میں ملوث قرار دی گئی۔ این جی اوز نے پولیس پر الزام لگایا کہ اس نے بعض اوقات جنسی زیادتی کے متاثرین کا استحصال کیا اور دھمکایا کہ الزام واپس لے لیں، خاص طور پر جب پولیس نے مجرموں سے رشوت وصول کی یا مجرموں کا تعلق کسی اثر رسوخ والی برادری سے تھا۔ کچھ پولیس افسروں نے متاثرہ فریق سے جنسی زیادتی کا مقدمہ درج کرنے سے قبل رشوت طلب کی، اور بعض اوقات تفتیش خانہ پُری کے طور پر کی گئی۔ بعد از زیادتی طبی معائنہ کے رجحان میں اضافہ ہوا لیکن بہت سے علاقوں میں طبی عملہ کے پاس مناسب تربیت یا آلات نہیں تھے، جو کہ قانونی کارروائی میں مزید پیچیدگی کا باعث بنا۔ جنسی

زیادتی کے واقعات کا تصفیہ اکثر ماورائے عدالت اقدامات کے ذریعے کیا گیا، اور اکثر مقدمات میں متاثرہ خاتون کی حملہ کرنے والے سے زبردستی شادی کروائی گئی۔

کوئی خاص وفاقی قانون گھریلو تشدد کی، جو کہ بہت عام تھا، ممانعت نہیں کرتا۔ گھریلو تشدد کے واقعات میں اطلاعات کے مطابق مارپیٹ، جسمانی ہیئت بگاڑنا، خواتین کے ابرو یا بال مونڈنا اور —زیادہ شدید معاملات میں– قتل شامل تھے۔ سسرال والوں نے اپنے بیٹوں کی بیویوں کو ہراساں کیا۔ جہیز اور دیگر خاندانی تنازعات کا نتیجہ کبھی کبھار موت یا جلا کر یا تیزاب پھینک کر شکل بگاڑ دینے کی صورت میں نکلا۔

جن عورتوں نے ظلم کے خلاف مقدمہ درج کروانا چاہا ان کو گھمبیر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس اور جج بعض اوقات گھریلو تشدد کے واقعات کو خاندانی تنازعات کے پس منظر میں دیکھ کر، کوئی قدم اٹھانے سے کتراتے تھے۔ فرد جرم عائد کرنے کے بجائے پولیس نے فریقین کی حوصلہ افزائی کی کہ آپس میں صلح کر لیں۔ حکام جبر کا شکار عورتوں کو بدسلوکی کے مرتکب خاندانوں کو واپس کرنے کے دستور پر عمل پیرا تھے۔

صنفی بنیادوں پر تشدد اور بدسلوکی کی اطلاع دینے والی خواتین کے بارے میں منفی معاشرتی روایات کو توڑنے کے لیے حکومت نے خواتین کے لیے خصوصی پولیس اسٹیشن قائم کر کے خواتین اہلکار مقرر کیں تاکہ متاثرہ عورتوں کو ایسی محفوظ پناہ گاہ میسر کی جاسکے جہاں وہ محفوظ انداز میں شکایات درج اور مقدمات رپورٹ کرا سکیں۔ تاہم خواتین کے یہ پولیس اسٹیشن اسٹاف کی کمی اور محدود سامان کے ساتھ مشکلات کا شکار رہے۔

حکومت نے بحران کا شکار خواتین کے لیے مرکز چلانا بھی جاری رکھا، جن کے توسط سے، زیادتی کا شکار خواتین کو غیر سرکاری تنظیموں کی جانب مدد حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ سرکاری مالی امداد سے ملک بھر میں قائم شہید بینظیر بھٹو مراکز برائے خواتین نے قانونی امداد، طبی علاج اور نفسیاتی مشاورت فراہم کی۔ یہ مراکز ایسی خواتین کو خدمات فراہم کرتے ہیں جو استحصال اور تشدد کا شکار تھیں۔ بعد ازاں متاثرین کو دارالامان کے حوالے کیا گیا، زیادتی کا شکار خواتین اور بچوں کے لیے یہ پناہ گاہیں ملک بھر میں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ دارالامان نے طبی علاج کی سہولت بھی فراہم کی۔ غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق، ان مراکز نے تاہم خواتین کو دیگر شعبوں میں مدد جیسے قانونی رہنمائی یا مشاورت شامل ہیں، کی پیشکش نہیں کی، اور وہ اکثر زنا کے مقدمات کی سماعت کی منتظر خواتین کے لیے، جو عصمت دری اور گھریلو بدسلوکی کا شکار تھیں، بطور انتظار گاہ کام آئے۔

سرکاری مراکز میں مناسب جگہ، عملے اور وسائل کی کمی تھی۔ بہت سے دارالامان کے اندر حالات بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں تھے۔ بہت سارے تو گنجائش سے زیادہ بھرے ہوئے تھے، بعض جگہوں پر ۳۵ خواتین کے استعمال کے لیے صرف ایک بیت الخلاء میسر تھا۔ چند پناہ گھروں نے بنیادی ضروریات جیسے نہانے، کپڑے دھونے کے سامان یا نسائی حفظان صحت کی مصنوعات کی سہولیات فراہم نہیں کیں۔ بعض واقعات میں خواتین

کے ساتھ سرکاری پناہ گھروں میں مبینہ طور پر بدسلوکی کی گئی، ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی گئی یا ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ظلم کرنے والوں کے پاس واپس جائیں۔

عورتوں کو پناہ گاہوں سے باہر بھیجنے اور طوائف کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے کچھ اطلاعات تھیں۔ پناہ گاہوں کے عملے نے مبینہ طور پر خواتین کے ساتھ اس مفروضے کی بنیاد پر امتیازی سلوک کیا کہ وہ اس لیے گھر سے بھاگ کر آئیں ہیں کیونکہ وہ غلط شہرت رکھنے والی عورتیں تھیں۔

عورتوں کے ختنے کا معاملہ: کوئی بھی ملکی قانون عورتوں کے ختنے کے حوالے سے رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کے گروپوں اور ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق بہت سے داؤدی بوہرہ مسلمانوں نے عورتوں کی ختنہ کے مختلف طریقوں پر عملدرآمد کیا۔ دیہی سندھ اور بلوچستان میں کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائل اور کمیونٹی بھی اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔ کچھ داؤدی بوہرہ افراد نے کھلے عام اس موضوع پر بات چیت کی اور اس عمل کے خلاف آن لائن درخواستوں پر دستخط کیے۔

دیگر خطرناک روایتی طریقے: بعض اوقات خواتین مختلف قسم کے سماجی تشدد اور بدسلوکی کا شکار رہیں، جن میں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل، زبردستی شادی اور مذہب تبدیل کرنا، جبری تنہائی، اور قبائلی تنازعات کو حل کرنے کے لیے ملکیت کے طور پر استعمال کیا جانا شامل ہے۔ ۲۰۰۴ء کا غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے قانون، ۲۰۱۱ء کا عورت مخالف کارروائیوں کی روک تھام کا ایکٹ اور انسداد جرائم قانون میں ۲۰۱۶ء میں کی گئی ترمیم (غیرت کے نام پر قتل کا جرم) ایکٹ روایات کے نام پر عورتوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کو جرم قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان قوانین کے باوجود، سینکڑوں خواتین نام نہاد غیرت کے نام پر قتل ہوئیں اور بہت سارے واقعات کے نہ تو مقدمات درج ہوئے نہ ہی کسی کو سزا دی گئی۔ بہت سے مقدمات میں نام نہاد غیرت کی پامالی میں ملوث مرد کو قتل نہیں کیا گیا جاتا بلکہ فرار ہونے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اکتوبر ۲۰۱۶ء میں حکومت نے غیرت کے نام پر قتل عام کے خلاف قانون کو منظور کر کے وہ جھول ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جس کے تحت مقتول کے ورثاء کی جانب سے معاف کرنے کی صورت میں قتل کے مرتکب افراد بری ہو جاتے تھے۔

غیرت کے نام پر جرائم اکثر خاندان کے اندر ہی ہونے کی وجہ سے زیادہ تر رپورٹ نہیں ہوئے۔ پولیس اور این جی اوز نے رپورٹ کیا کہ ذرائع ابلاغ میں بڑھتی ہوئی کوریج نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو چند واقعات میں محدود انداز میں مرتکب افراد کے خلاف کارروائی کے قابل بنایا۔ جولائی ۲۰۱۶ء میں میڈیا کی مشہور شخصیت فوزیہ عظیم (قندیل بلوچ کے نام سے مشہور) کا جنوبی پنجاب میں اپنے بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بھائی نے کہا کہ اس کی بہن اپنے آزادانہ طرز زندگی کی وجہ سے خاندان کے لیے ندامت کا سبب بنی تھی۔ حکومت نے بلوچ کے بھائی اور اس کے ساتھیوں پر قتل پر فرد جرم لاگو کیا، ریاست کو مقدمہ میں فریق بنایا اور خاندان والوں کو اس کے بھائی کو "معاف" کر کے بری ہونے سے روک دیا، جیسا کہ اس قسم کے قتل کے مقدمات میں اکثر ہوتا ہے۔

عورت کا ناک اور کان کاٹنے کے واقعات، خاص طور پر غیرت سے متعلقہ جرائم میں، رپورٹ ہوئے، لیکن قانونی رد عمل شاذ و نادر ہی دیکھا گیا۔

مارچ میں پارلیمنٹ نے وفاقی ہندو شادی ایکٹ پاس کیا۔ یہ قومی قانون ہندو برادری کی شادیوں کا اندراج کرنے اور انکا منطقی جواز ثابت کرنے کے لیے قانونی دستاویزی طریقہ فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ ہندو برادری کے رہنما قانون سازی کو ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ جبری شادیاں روکنے کے لیے مثبت قدم قرار دیتے ہیں، لیکن اس قانون میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ کسی ایک فریق کی جانب سے ہندوازم کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرنے کی صورت میں یہ شادی ٹوٹ جائے گی۔ سندھ کے ہندو میرج ایکٹ ۲۰۱۶ء میں بھی اسی قسم کی شق شامل تھی۔

خواتین مخالف روایات کے خاتمے کا ترمیمی ایکٹ ۲۰۱۱ء ان ساری روایات کو جرم قرار دیتا ہے جن میں کسی بھی دیوانی یا فوجداری مقدمہ کے تصفیہ کی غرض سے عورت کو شادی کے لیے پیش کیا جائے؛ عورت کو دھوکہ دہی یا غیر قانونی طریقوں سے ملکیت کے حق وراثت سے محروم کیا جائے؛ حق غصب کیا جائے یا کسی بھی طریقہ سے عورت کو زبردستی شادی کے لیے مجبور؛ یا قرآن پاک کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور، ایسی شادی کا انتظام یا سہولت بہم پہنچائی جائے، بشمول قرآن پاک پر عورت سے یہ حلف لینے کے کہ وہ غیر شادی شدہ رہے گی اور جائداد میں حق وراثت طلب نہیں کرے گی۔ قانون کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باوجود کچھ علاقوں میں ان روایات پر عمل جاری رہا۔ قانون کوئی بھی جلانے والا مواد استعمال کرتے ہوئے زخمی یا قتل کرنے کو سنگین جرم قرار دے کر اس قسم کے جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف سخت سزا تجویز کرتا ہے۔ دیگر قوانین کے ساتھ یہ اقدامات بھی فاٹا اور پاٹا میں قابل عملدرآمد نہیں تاوقتیکہ صدر مملکت ان کے نفاذ کا حکم نامہ جاری نہ کریں۔ ملک میں عورتوں کے اوپر تیزاب پھینکنے کے بیشمار واقعات ہوئے لیکن ان میں سے کچھ ہی واقعات کے ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاسکا۔

نیشنل کمیشن آن دی اسٹیٹس آف ویمن بل ۲۰۱۰ء (خواتین کی حیثیت کے بارے میں قانون) عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزیوں کی تفتیش کی خاطر کمیشن کو مالی اور انتظامی خود مختاری فراہم کرتا ہے لیکن عورتوں کے حقوق کے لیے سرگرم کارکنوں کے بقول اس کمیشن کے پاس ذرائع کی کمی تھی اور یہ بے اختیار رہا۔

جنسی ہراسگی: ملازمت کی جگہ اور عوامی مقامات پر جنسی ہراسگی کو جرم قرار دیے جانے کے قوانین کی موجودگی کے باوجود یہ مسئلہ بڑے پیمانے پر جاری رہا۔ قانون سارے صوبوں پر لازمی قرار دیتا ہے کہ صوبائی سطح پر محتسب مقرر کریں۔ سندھ ۲۰۱۲ء میں ایسا کرنے والا پہلا صوبہ تھا۔ صوبہ پنجاب اور گلگت بلتستان نے بھی محتسب کے ادارے قائم کیے۔

آبادی پر کنٹرول کے لئے جبر: ملک میں زبردستی اسقاط حمل، غیر رضاکارانہ نس بندی یا آبادی پر کنٹرول کے دیگر جبری طریقوں کے اطلاق کے بارے میں اطلاعات نہیں تھیں۔ زچہ وبچہ کی اموات کی شرح، اور مانع حمل اشیاء کے پھیلاؤ کے بارے میں معلومات مندرجہ ذیل ویب سائیٹ پر دستیاب ہیں:
www.who.int/reproductivehealth/publications/monitoring/maternal-mortality-2015/en/

تفریق: قانون عام طور پر صنف کی بنیاد پہ تفریق کرنے سے روکتا ہے، لیکن حکام نے اس قانون کو نافذ نہیں کیا۔ عورتوں کو ملازمت، عائلی قوانین، جائداد کے قانون اور عدالتی نظام میں امتیاز کا سامنا کرنا پڑا۔ عائلی قانون طلاق کے معاملات میں خواتین کو تحفظ فراہم کرتا ہے بشمول نان نفقہ کے اور چھوٹے بچوں کی سپرداری اور نان نفقہ کے حوالے سے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قانون بیویوں کو بچوں کی بہ نسبت ملکیت میں آدھے حصے کا وارث بناتا ہے۔ بیویوں کو ان کے شوہر کی جائداد کا آٹھواں حصہ ورثہ میں ملتا ہے، لیکن عورتوں کو اکثر اپنے قانونی حق سے بہت کم حصہ دیا گیا۔

بچے

پیدائش کا اندراج: شہریت ملک میں پیدائش سے حاصل ہوتی ہے، اگرچہ سنہ ۲۰۰۰ء کے بعد بیرون ملک پیدا ہونے والے بچوں کی شہریت کا تعین والدین کی نسبت سے کیا جاسکتا ہے اگر والدہ یا والد ملک کا شہری ہے اور بچے کا مجاز حکام کے پاس اندراج موجود ہو۔ (سیکشن دوئم۔ د۔ ملاحظہ کیجیئے۔)

تعلیم: آئین ۵ سے ۱۶ سال عمر کے سب بچوں کے لیے، حکومت کی جانب سے مفت، تعلیم دیئے جانے کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اس آئینی حق کے باوجود سرکاری اسکولوں میں والدین سے کتابوں، یونیفارم اور دیگر سامان کی مد میں پیسے وصول کئے گئے۔

طبی سہولیات: لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو سرکاری صحت مراکز تک رسائی حاصل تھی، اگرچہ ان کے خاندان والے بسا اوقات لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کے لیے طبی امداد لینے کو ترجیح دینے والے تھے۔

بچوں سے بدسلوکی: بچوں سے بدسلوکی عام تھی۔ آجروں نے، جو بعض جگہوں پر رشتہ دار تھے، گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرنے والی چھوٹی لڑکیوں اور لڑکوں کو مار پیٹ اور ان سے دیر تک کام کروا کر بدسلوکی کی۔ ان میں سے بہت سے بچے اسمگل کئے گئے۔

مقامی سربرآوردہ افراد نے بچوں کو تکلیف دہ رسومات کی بھینٹ چڑھایا۔ لڑکیوں کو تنازعہ کے تصفیہ اور واجب الادا قرض کے معاوضہ میں دیا گیا۔

۲۰۱۶ء میں حکومت نے کمسن سے جنسی زیادتی کی تشریح کو تبدیل کرتے ہوئے اس میں ۱۶ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ "لڑکوں" کو بھی شامل کیا۔

بچپن کی اور زبردستی کی شادی: قانونی پابندیوں کے باوجود بچوں کی شادیاں انجام پائیں۔ وفاقی قانون شادی کے لیے مردوں کی عمر ۱۸ سال اور عورتوں کی عمر ۱۶ سال مقرر کرتا ہے۔ صوبہ سندھ میں سندھ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ ۲۰۱۴ء کے تحت لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے شادی کی قانونی عمر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔ ۱۹۲۹ء کے وفاقی چائلڈ میرج ریسٹرنٹ ایکٹ ترمیم نے قانون کی پامالی کے مرتکب افراد کے لیے سزا میں نمایاں اضافہ کیا۔ ترمیم کے تحت خلاف ورزی کرنے والے کو ۱۰ سال تک اور ۵ سال سے کم نہیں (قبل ازیں ایک مہینہ سے زائد قید سے اوپر) کی سزا ملے گی اور ۱۰ ایک ہزار روپے (۹ ڈالر) جرمانے کو بڑھا کر ایک لاکھ روپے (۹،۰۰۰ ڈالر) تک جرمانہ کیا جائے گا۔

۲۰۱۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بچپن میں شادی کے [مخالف] قانون کو غیر اسلامی قرار دیا اور تبصرہ کیا کہ "یہ قانون غیر منصفانہ ہے اور شادی کے لیے کوئی بھی قانونی عمر مقرر نہیں ہو سکتی۔" کونسل نے کہا کہ اسلام کم عمری کی شادی کی ممانعت نہیں کرتا کیوں کہ رخصتی جب دونوں شریک حیات کے بالغ ہونے پر ہی ہو سکتی ہے۔ کونسل کے فیصلے کو تسلیم کیا جانا لازم نہیں۔

۲۰۱۷ء میں قومی سطح پر کئے گئے گیلپ سروے کے مطابق ۲۴ اعشاریہ ۷ فیصد خواتین کی شادی ۱۸ سال سے کم عمر میں ہوئی۔ دیہی علاقوں میں غریب والدین نے بعض اوقات اپنی بیٹیوں کو شادی کے لیے فروخت کر دیا، کچھ معاملات میں قرض ادا کرنے یا جھگڑوں کے حل کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اگرچہ زبردستی کی شادی ایک سنگین جرم ہے اور بہت سے مقدمات بھی درج ہوئے لیکن قانونی چارہ جوئی کافی کم عمل میں آئی۔

بچوں کا جنسی استحصال: ۲۰۱۶ء میں پارلیمینٹ نے بچوں کو فحش فلمسازی، جنسی زیادتی، فحاشی کی ترغیب اور ظلم وستم کے مخصوص جرائم سے محفوظ رکھنے کے لیے فوجداری قانون میں ترمیم کی۔ ۱۹۶۱ء کا انسداد جسم فروشی آرڈیننس اور تعزیرات پاکستان کی بعض شقیں بچوں کو بوجہ سماجی و معاشی حالات جنسی استحصال کے خطرات، بشمول بدکاری کے لیے اسمگلنگ، سے بچانے کے لیے ہیں مگر حکام نے ان قوانین کو باقاعدگی کے ساتھ نافذ نہیں کیا۔ عریانی وفحاشی سے متعلقہ قوانین کے تحت، بچوں کی فحش فلمیں بنانا غیر قانونی ہے۔

کمسن بچوں کا قتل یا معذور بچوں کو مارنا: قانون کے مطابق، اگر کوئی کسی معصوم بچے کو ترک کر دیتا ہے تو اس کو سات سال تک قید کی سزا ہو سکتی ہے، جب کہ اگر کوئی معصوم بچے کو خفیہ طور پر دفناتے ہوئے پکڑا گیا تو اس کو دو سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ قتل کی سزا عمر قید ہے، لیکن حکام نے معصوموں کے قتل کے مقدمات میں کبھی کبھار ہی قانونی کارروائی کی۔

بے گھر بچے: سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق عسکری کارروائیوں کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے بچوں کے لیے حصول تعلیم اور نفسیاتی اعانت تک رسائی مشکل تھا۔ اسپارک اور بچوں کے حقوق پر کام کرنے والی دوسری تنظیموں نے تشویش کا اظہار کیا کہ سیلاب اور تنازعات کی وجہ سے بے گھر ہونے والے بچے جبری مشقت میں پھنسنے کے خطرے سے دوچار تھے، کیوں کہ کچھ خاندان شہری علاقوں کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔

بچوں کے اغوا کے بین الاقوامی واقعات: پاکستان ۱۹۸۰ء کے ہیگ کنونشن آن دی سول ایسپیکٹس آف انٹرنیشنل چائلڈ ایبڈکشن میں شامل ہے۔ اس حوالہ سے محکمہ خارجہ کی انٹرنیشنل پیرنٹل چائلڈ ایبڈکشن پر سالانہ رپورٹ ملاحظہ کیجئے:
http://travel.state.gov/content/childabduction/en/legal/compliance.html

صیہونی مخالفت

ملک میں یہودیوں کی آبادی بہت کم ہے۔ قومی پریس میں یہودی مخالف جذبات کا اظہار عام تھا۔ روایتی ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطوں کے ذرائع پر نفرت انگیز نشریات میں گروہوں یا افراد کو نشانہ بناتے ہوئے "یہودی ایجنٹ" جیسے توہین آمیز اصطلاحات استعمال کی گئیں۔

بردہ فروشی یا انسانی اسمگلنگ

محکمہ خارجہ کی ٹریفکنگ ان پرسنس رپورٹ ملاحظہ کیجئے:
www.state.gov/j/tip/rls/tiprpt/

معذور افراد

قانون معذور افراد کو برابر حقوق فراہم کرتا ہے لیکن حکام نے ان قوانین کو باقاعدگی سے نافذ نہیں کیا۔ ۲۰۱۱ء میں وزارت سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم تحلیل ہونے کے بعد، اس سے منسلک محکمے بشمول ڈائریکٹوریٹ جنرل آف اسپیشل ایجوکیشن، معذوروں کی بحالی کا قومی کونسل اور معذوروں کے بارے میں قومی ٹرسٹ بھی دارالخلافہ انتظامیہ اور ترقی ڈویژن کو منتقل کیے گئے۔ صوبوں کو منتقل کیے گئے خصوصی تعلیم اور سماجی بہبود کے دفتر، معذور افراد کے حقوق کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں۔

سندھ میں وزیر برائے انسداد بیگار اور خصوصی تعلیم پر قانون ذمہ داری ڈالتا ہے کہ معذور افراد کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے۔ سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق بہت سے معذور بچے اسکول میں داخل نہیں تھے۔

وفاقی اور صوبائی سطح پر ملازمت کے مقرر کردہ کوٹہ نظام سرکاری اور نجی اداروں کو پابند کرتا ہے کہ کم از کم دو فیصد ملازمتیں معذوری کا شکار مگر قابل افراد کے لیے مختص کریں۔ نفاذ کے نظام کے ناقص ڈھانچے کے باعث حکام اس قانونی تقاضہ کا مکمل طور پر اطلاق نہیں کر پائے۔

جو ادارے معذور افراد کو بھرتی نہیں کرنا چاہتے تھے وہ متبادل کے طور پر معذور افراد کے لیے فنڈ میں جرمانہ ادا کر سکتے تھے۔ حکام نے کبھی کبھار اس ذمہ داری پر عمل درآمد کروایا۔ قومی کونسل برائے بحالیٔ معذور افراد نے ملازمتیں، قرض کی سہولت اور گزارے کے لیے وظائف فراہم کیے۔ سواری اور پولنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں مشکلات کی وجہ سے معذور افراد کے لیے انتخابات میں ووٹ ڈالنا بہر حال بہت مشکل عمل تھا۔ لیکن الیکشن ایکٹ ۲۰۱۷ء معذور افراد کی جانب سے بذریعہ ڈاک ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات میں ممکنہ حد تک پولنگ اسٹیشن پہلی منزل پر قائم کرنے اور ان تک معذور افراد کی رسائی ممکن بنانے کی خاطر ریمپ [ویل چیئر کا راستہ] سے آراستہ کرنے کی ہدایات جاری کی ہیں۔

جنسی رجحان اور صنفی شناخت کی بنیاد پر تشدد، تفریق اور دیگر اقسام کی بدسلوکی کے اقدامات

باہمی اتفاق سے ہم جنس پرستی مجرمانہ فعل ہے، لیکن، حکومت نے اس جرم کے حوالہ سے بہت کم سزا دی۔ ہم جنس پرستی کی سزا میں جرمانہ، دو سال سے لیکر عمر بھر تک قید، یا دونوں شامل ہیں۔ ہم جنس پرست خواتین، ہم جنس پرست مرد، ہیجڑے، مرد خواجہ سرا، مذکر و مؤنث دونوں خصوصیات کے حامل افراد نے کبھی کبھار ہی اپنی جنسی شناخت یا رجحان کو افشاء کیا۔ خواجہ سرا خواتین کی باقاعدہ چلتی پھرتی برادری موجود تھی مگر وہ بھی الگ تھلگ تھی اور تشدد اور بارہا چھیڑ خانی کا شکار تھی۔ کوئی خاص قانون جنسی رجحان یا صنفی امتیاز سے تحفظ فراہم نہیں کرتا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی نے لیزبین، گیز، بائے سیکسیوئل، ٹرانس جینڈر، انٹر سیکس (ایل جی بی ٹی آئی) امور پر خیالات کے اظہار اور میل جول کے حوالے سے بنایا گیا ملک میں اپنی نوعیت کا پہلا آن لائن پلیٹ فارم بند کر دیا لیکن سوشل میڈیا پر "ایل جی بی ٹی آئی" اور متعلقہ امور پر کام کرنے والے صفحات فعال ہیں۔

ایل جی بی ٹی آئی افراد کے خلاف تشدد اور تفریق جاری رہی۔ پولیس نے عام طور پر ایل جی بی ٹی آئی کمیونٹی کے کسی بھی رکن سے متعلق مقدمات میں قانونی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ کراچی میں، سندھ پولیس ۳۰ اگست کے قتل اور ستمبر میں دو اجتماعی عصمت دری کے واقعات سمیت خواجہ سرا

خواتین کے خلاف ہونے والے جرائم کے مقدمات میں کوئی بھی قدم اٹھانے میں سست روی کا شکار اور بے اعتناء رہی۔ اس کے برعکس، خیبر پختونخوا میں این جی اوز کی کوششوں کی بدولت پولیس اور خواجہ سرا برادری کے درمیان مسائل پر بات چیت میں اضافہ ہوا۔

ایل جی بی ٹی کے حقوق پر کام کرنے والی این جی اوز اور کارکنوں کے مطابق، معاشرے نے "ہجڑا" کے طور پر معروف خواجہ سرا خواتین، مخنث اور انٹر سیکس افراد سے لاتعلقی اختیار کی ہوئی ہے۔ یہ افراد لفظ "ہجڑا" کو تذلیل آمیز گمان کر کے اپنے لیے "خواجہ سرا" کی اصطلاح استعمال کرنے کو پسند کرتے ہیں، یہ اکثر کچی آبادیوں میں رہائش پذیر ہو کر، بھیک مانگ کر، میلوں اور شادیوں میں ناچ کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جسم فروشی کا کام بھی کر رہے تھے۔ مقامی حکام نے اکثر خواجہ سراؤں کو اسکول یا اسپتال میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کیا جبکہ مکان مالکان اس کمیونٹی کو گھر کرائے پر دینے سے کتراتے ہیں۔ بااثر افراد نے خواجہ سراؤں کو اکثر ملکیت کی تقسیم میں حق موروثیت سے بھی محروم رکھا۔ سپریم کورٹ کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں ایک فیصلے میں خواجہ سرا افراد کو "تیسری جنس" کے طور پر تسلیم کیا گیا اور ان کو درست شناختی کارڈ حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس قانونی فیصلے کی بدولت خواجہ سرا افراد ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں بحیثیت امیدوار اور ووٹر شریک ہوئے۔

ایچ آئی وی اور ایڈز کے متعلق سماجی حقارت

ملک میں ایچ آئی وی ایڈز کی بیماری صفر اعشاریہ ایک فیصد آبادی میں پائی جاتی ہے۔ اندازے کے مطابق ایچ آئی وی میں مبتلا ۹۳ فیصد افراد فقط دو صوبوں پنجاب (۵۰ فیصد) اور سندھ (۴۳ فیصد) میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ وبا خاص طور پر ٹیکہ کے ذریعہ سے نشہ کرنے والے افراد میں عام ہے۔ عام آبادی اور حفظان صحت کے ذمہ دار عملے کی جانب سے حقارت اور امتیازی سلوک اس مرض میں مبتلا افراد کی علاج تک رسائی میں بڑی رکاوٹ بنا رہا۔

دیگر سماجی تشدد اور امتیازی سلوک

مذہبی عدم برداشت کے باعث سماجی تشدد ایک گھمبیر مسئلہ بنا رہا۔ عیسائی، احمدی، ہندو اور شیعہ مسلمانوں سمیت مذہبی اقلیتوں کے خلاف گاہے بگاہے بلوہ کی اطلاعات آئیں۔

بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں شیعہ مسلمان ہزارہ نسلی اقلیت کو امتیازی سلوک اور تشدد کے خوف کا سامنا رہا۔ سال کے دوران کم از کم ۱۳ ہزارہ شیعہ مسلمان چن چن کر قتل کئے گئے۔ مثال کے طور پر، ۱۹ جولائی کو، نامعلوم مسلح افراد نے کوئٹہ سے کراچی سفر کرنے والے چار افراد پر مشتمل ایک ہزارہ شیعہ خاندان کو قتل کر دیا۔ پریس رپورٹوں اور دیگر ذرائع کے مطابق، ہزارہ برادری کے افراد دو ہزارہ رہائشی علاقوں سے باہر نکل کر کوئٹہ شہر میں آزاد نقل و حرکت کرنے سے قاصر تھے۔ ان رہائشی علاقوں میں عام استعمال کی اشیاء مہنگے داموں پر دستیاب تھیں جبکہ ہزارہ افراد کے مطابق ان

کو تلاش روزگار اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ سرکاری ادارے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ جاری کرنے میں امتیازی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پُر تشدد واقعات سے حفاظت کے لیے حکام نے شیعہ جلوس بھی ہزارہ برادری کے مذکورہ رہائشی مضافات تک محدود کر دیئے۔

حصہ ہفتم۔ محنت کشوں کے حقوق

(الف)۔ تنظیم سازی اور اجتماعی سوداکاری کا حق

افرادی قوت کی کثیر آبادی صوبائی لیبر قوانین کے تابع تھی۔ ۲۰۱۰ء کی اٹھارویں آئینی ترمیم نے محنت کشوں کے بارے میں قانون سازی اور پالیسی کے اختیارات چاروں صوبوں کو منتقل کئے لیکن ساتھ یہ بھی صادر کیا کہ موجودہ قوانین اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے جب تک صوبائی حکومت ان کو "تبدیل، ختم یا ترمیم نہیں کرتی۔" صوبوں نے ۲۰۱۱ء میں صنعتی تعلقات کے اپنے مقامی قوانین نافذ کئے۔ ۲۰۱۲ء میں پارلیمینٹ نے صنعتی تعلقات کا نیا ایکٹ پاس کیا، جس میں بین الاقوامی ادارہ برائے محنت کش افراد (آئی ایل او) کے قوانین کو بھی شامل کیا گیا مگر ان کو فقط وفاقی دارالحکومت اسلام آباد اور ان تجارتی فیڈریشنوں تک نافذ العمل قرار دیا جو کہ ایک سے زائد صوبوں میں فعال تھیں۔ افرادی قوت کی اکثریت کسی بھی قسم کی وفاقی قواعد وضوابط برائے لیبر کے زیر سایہ نہیں تھی۔

اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کے بعد وفاقی حکومت کا کردار غیر واضح رہا۔ محنت کش افراد کے امور کے بارے میں کچھ حد تک بااختیار وفاقی ادارہ فقط وزارتِ برائے سمندر پار پاکستانی وترقی انسانی وسائل تھا، جس کا مقامی لیبر کی نگرانی میں کردار آئی ایل او ضوابط پر عملدرآمد دکھانے کی غرض سے اعداد وشمار جمع کرنے تک محدود تھا۔ صوبائی سطح پر اجتماعی سودے کاری کے حقوق یقینی بنانے والے قوانین کی عملداری میں بینکاری اور مالیاتی شعبہ، جنگلات، طبی عملہ، اپنا کاروبار کرنے والے کسان اور انتظامی عہدوں پر تعینات افراد شامل نہیں تھے۔

قومی سطح کی قانون سازی اور مزدوروں کے امور کے ذمہ دار وفاقی ادارے کی غیر موجودگی میں، قومی کمیشن برائے صنعتی تعلقات کا تاحال وجود میں رہنا ایک سوالیہ نشان ہے۔ وفاقی صنعتی تعلقات ایکٹ ۲۰۱۲ء بیان کرتا ہے کہ یہ کمیشن وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کی حدود میں ان صنعتی تنازعات کا فیصلہ کرے گا جن میں ٹریڈ یونین یا ٹریڈ یونین کی فیڈریشن فریق ہے اور یہ کمیشن حکومت کی جانب سے قومی اہمیت کے حامل قرار دیئے گئے صنعتی تنازعہ کو حل کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ لیکن یہ قانونی شق بین الصوبائی تنازعات کے حوالہ سے خصوصی فورم فراہم نہیں کرتی اور بظاہر اس امکان کو اظہار کرتی ہے کہ کمیشن اس نوعیت کے تنازعات حل کر سکتی ہے۔

مزدور تنظیموں کے مطابق لیبر ریلیشنز قوانین کو صوبائی سطح پر نافذ کرنے میں اہلیت اور مالی وسائل کی عدم دستیابی کے مسائل حائل ہیں جبکہ اس ضمن میں وفاقی حکومت کی جانب سے ورکرز ویلفیئر فنڈ اور ایمپلائیز اولڈ ایج بینیفٹ انسٹیٹیوشن کو صوبوں کو منتقل کرنے کے بجائے اپنے کنٹرول میں رکھنے پر بھی تکرار تھی۔

قانون ریاستی عہدیداروں، سرکاری تجارتی اداروں اور ایکسپورٹ پروسیسنگ زونز یا سرکاری شعبے کے کارکنوں کو اجتماعی سودے کاری یا ہڑتال کرنے سے منع کرتا ہے، لیکن مزدور تنظیموں نے رپورٹ کیا کہ گذشتہ سال کے دوران اس قانون پر عملدرآمد نہیں کیا گیا۔ صوبائی انڈسٹریل ریلیشنز قوانین بھی ہڑتال اور تالابندی کو محدود کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خیبر پختونخوا کا ایکٹ بیان کرتا ہے کہ "اگر ہڑتال یا تالابندی ۳۰ دن سے زیادہ برقرار رہتی ہے تو، حکومت تحریری حکم نامے کے تحت ہڑتال یا تالابندی پر پابندی نافذ کر سکتی ہے" اور پھر اس پر لازم ہے کہ تنازعہ کو لیبر کورٹ میں لے جائے۔

مزدور تنظیمیں وسیع پیمانے پر ہڑتالیں منعقد کرنے میں کامیاب ہوئیں، لیکن پولیس نے اکثر ان کی ہڑتالوں کو زبردستی ختم کروایا اور مالکان نے اس احتجاج کو ملازمین کی برطرفیوں کے جواز کے طور پر استعمال کیا۔ پیدل مارچ اور احتجاجی مظاہرے بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہے، باوجود اس کے کہ پولیس نے بہت سارے یونین رہنماؤں کو گرفتار کر کے ان پر انسداد دہشت گردی اور ریاست مخالف سرگرمیوں کے قوانین کے تحت فرد جرم عائد کیں۔ سال بھر کے دوران تشدد اور تنظیم سازی کی آزادی سے متعلقہ مسائل چھائے رہے۔

وفاقی قانون غیر قانونی ہڑتالوں، دھرنہ بازی اور دیگر اقسام کے احتجاج کو سول بدامنی کا باعث جرم ٹھہراتا ہے، جس کی سزا عمر قید تک ہے۔ یہ قانون بیان کرتا ہے کہ چار یا اس سے زائد افراد کے اجتماع کے لیے پولیس کی اجازت لازمی ہے، اس قاعدہ کو حکام ٹریڈ یونین کے اجتماعات کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں کیوں کہ وفاقی حکومت کو فوجداری معاملات پر اختیار حاصل ہے۔

سیاسی منشا اور وسائل کی قلت کے باعث لیبر قوانین کا بڑے پیمانے پر نفاذ کمزور رہا۔ زیادہ تر یونین تنظیمیں سرکاری اور سیاسی پارٹیوں کے اثر سے آزاد ہو کر کام کرتی رہیں۔ مزدور رہنماؤں نے مؤثر یونین سازی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے مالکان کی مالی اعانت سے قائم کردہ "انتظامیہ۔ دوست" اور کاغذی ورکر یونین" یا نام نہاد "ییلو یونینز" کی موجودگی پر تحفظات کا اظہار کیا۔

حکومت کی جانب سے جائز طریقے کے بغیر کسی یونین کو تحلیل کرنے کی کوئی رپورٹ نہیں تھی۔ اس کے باوجود انتظامی طور پر یونین کی رجسٹریشن عدالتی جائزے کے حق کے بغیر رد کی جا سکتی تھی۔

مزدوروں کے حقوق کے لیے سرگرم غیر سرکاری تنظیموں نے محنت کشوں کی مدد کرتے ہوئے ان کو فنی تربیت اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی تربیتی نشستیں منعقد کیں جس کا مقصد لیبر یونینز اور ٹریڈ تنظیموں کو مضبوط کرنا تھا۔ انہوں نے پہلے سے موجود لیبر یونینز کے ساتھ مل کر غیر رسمی شعبے میں کام کرنے والے مزدوروں کو متحد کرنے اور مزدوروں کے حقوق، کام کرنے کے حالات اور خوشحالی کو یقینی بنانے کے لیے پالیسیوں اور قانون سازی کے لیے سرگرمی کی۔ این جی اوز نے صوبائی حکومتوں کے ساتھ مل کر زرعی کارکنوں، بھٹہ مزدوروں اور خطرات سے دوچار دیگر محنت کشوں کو قومی شناختی [کارڈ] کی فراہمی پر کام کیا تاکہ ان کو بھی ملک کے سماجی تحفظ کے نظام میں لایا جاسکے اور ووٹ، صحت اور تعلیم کی سہولیات سمیت شہری حقوق تک رسائی دی جاسکے۔

(ب)۔ جبری مشقت یا بیگار کی ممانعت

قانون ہر قسم کی جبری مشقت اور بیگار سے ممانعت، اور بیگار کیمپ کا قرضہ منسوخ کرتا ہے اور اسکی وصولی کے لیے قانونی چارہ جوئی پر بھی پابندی عائد کرتا ہے، جبکہ اس قانون کے نفاذ کے لیے ضلعی "نگراں کمیٹی" قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جانب وفاقی اور صوبائی قوانین ملازمین کو آجر سے اجازت لیے بغیر ملازمت چھوڑنے سے منع کرتے ہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے [جوابی قانونی کارروائی] کی صورت میں ان کو قید بامشقت کی سزا مل سکتی ہے۔

سیاسی عزم کی کمی، حکام کی مبینہ طور پر انسانی اسمگلنگ میں ملوث ہونے، قانون میں فنی خامیاں، وفاقی اور مقامی حکومتوں میں انتظامی تبدیلیوں اور مالی وسائل کی عدم دستیابی، جبری مشقت سے متعلقہ وفاقی قوانین نافذ کرنے میں حکام کی ناکامی کا باعث بنی۔ قانون سازی کے ڈھانچے میں بھی خلیج حائل رہی۔ اس کے نتیجہ میں قانون نافذ کرنے والے افسران نے جبری بیگار لینے کے جرائم کے مقدمات درج کرتے وقت، تعزیرات کی دیگر شقیں، بشمول اغوا اور غیر قانونی قید، لگائیں۔ وسائل، معائنہ اور ازالہ کی اقدامات ناکافی تھے، جبکہ وفاقی قانون کے تحت دی جانے والی سزائیں، بشمول ۵۰،۰۰۰ ہزار روپیہ (۴۵۰ ڈالر) جرمانہ، یا دو سے پانچ سال تک قید یا دونوں سزائیں، خلاف ورزیوں کی روک تھام کے لیے غیر مؤثر تھیں۔

ملک کی متعدد صنعتوں میں جبری مشقت اور بیگار بہت پائی جاتی تھی۔ این جی اوز کے اندازے کے مطابق ۲۰ لاکھ کے قریب لوگ بیگار کا شکار تھے، زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں، لیکن بلوچستان اور کے پی میں بھی موجود تھے۔ بیگار میں کام کرنے والوں میں زیادہ تر نچلی ذات کے ہندو اور عیسائی، جبکہ نچلے سماجی و معاشی پس منظر کے مسلمان شامل تھے۔ جبری مشقت شعبہ زراعت، بشمول کپاس، گنے اور گندم کی صنعتوں اور اس کے علاوہ اینٹوں کے، کوئلے اور قالین بافی کی صنعتوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ بیگار میں کام کرنے والے محنت کش عام طور پر یہ تخمینہ لگانے سے قاصر تھے کہ ان کی جانب واجب الادا قرض مکمل طور پر ادا ہو چکے ہیں یا نہیں، جس کی بڑی وجہ معاہدے کی عدم موجودگی، یا پھر مالکان کی جانب سے مزدوروں کی ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر قرضوں کی رقم یا بیج اور کھاد کی قیمتوں میں ردوبدل کرنا تھا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ زمینداروں نے مسلح محافظ مقرر کر کے مزدوروں کی

نقل و حرکت پر بندش لگادی یا ان کی طرف واجب الادا قرض کے عوض دوسرے آجروں کو فرخت کر دیا۔ پنجاب حکومت نے جبری بیگار اور بچوں سے مشقت کے خاتمے کے منصوبے کو مالی وسائل فراہم کیے۔ اس منصوبہ کے مقاصد میں بھٹہ مزدوروں کی بحالی، قانون نافذ کرنے اور خدمات فراہم کرنے والوں کی صلاحیتوں میں اضافہ اور حکومتی اقدامات کو مربوط بنانے کی کوششیں شامل ہیں۔

لڑکے اور لڑکیاں غیر قانونی بھکاری گروہوں، گھریلو ملازمت یا زراعت کے شعبہ میں جبری مشقت کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے خرید و فروخت، اغوا یا کرائے پر حاصل کیے جاتے رہے (ملاحظہ کیجیے سیکشن ہفتم ج)۔ غیر قانونی ایجنٹوں نے بہتر ملازمت کے جھانسے دے کر بچوں کے والدین سے پیسے بٹورنے کے بعد بچوں کا استحصال کرتے ہوئے ان سے گھریلو ملازمت، غیر ہنر مند لیبر اور چھوٹی دکانوں اور دیگر شعبوں میں جبری مشقت کروائی۔

جبری بیگار سے آزاد ہونے والے بعض مزدوروں کو دوسرے مقامات پر متبادل روزگار کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے اپنی پرانی حیثیت [جبری مشقت] پر واپس جانا پڑا۔ زمینداروں، صنعتکاروں اور بااثر سیاستدانوں کے گٹھ جوڑ نے اس مسئلہ کے مؤثر حل کی کوششوں کو نقصان پہنچایا۔ مثال کے طور پر کچھ مقامی پولیس والوں نے زمین یا بھٹہ مالکان کے خلاف یہ سوچ کر مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا کہ ان کے افسرانِ بالا شاید سیاست دانوں یا مالکان کے اپنے دباؤ سے متاثر ہو کر قانونی تفتیش کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔

خیبر پختونخوا، پنجاب اور سندھ کی لیبر وزارتوں نے اینٹوں کے بھٹوں اور ان میں کام کرنے والے کارکنوں کے اندراج پر کام کیا تاکہ اس صنعت کو مؤثر انداز میں چلایا جاسکے اور مزوروں کی لیبر کورٹ اور دیگر سہولیات تک رسائی ممکن ہو۔ انٹرنیشنل لیبر آرگنائیزیشن (آئی ایل او) حکام کے مطابق خیبر پختونخوا اور پنجاب حکومتوں نے اپنے صوبوں میں لگ بھگ سارے بھٹوں کا اندراج کر لیا ہے، جبکہ پنجاب نے بھٹوں کی ڈیجیٹل میپنگ بھی مکمل کر لی ہے۔ محکمہ لیبر پنجاب نے اینٹوں کے بھٹوں میں بچوں سے مزدوری کرانے کے سدباب اور جبری مشقت کے خاتمے کا منصوبہ کے تحت ورکرز کو قومی شناختی کارڈ، سود سے پاک قرض اور بھٹوں کے آس پاس اسکول کی فراہمی میں مزدوروں کی اعانت کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اطلاعات کے مطابق ۲۰۱۴ء میں آغاز سے لے کر اب تک، اس منصوبے کے تحت ۹۰،۰۰۰ بچوں کو اینٹوں کے بھٹوں سے ہٹا کر اسکولوں میں داخل کرانے میں کامیابی ہوئی ہے۔

محکمہ خارجہ کی ٹریفکنگ اِن پرسنس رپورٹ بھی مندرجہ ذیل ویب لنک پر ملاحظہ کیجیے:

www.state.gov/j/tip/rls/tiprpt/

اور محکمہ لیبر کی بچوں سے مشقت کی بدترین صورتوں کے بارے میں رپورٹ مندرجہ ذیل لنک پر موجود ہے:

www.dol.gov/ilab/reports/child-labor/findings

(ج)۔ بچوں سے مشقت کی ممانعت اور ملازمت کے لیے کم از کم عمر

آئین ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کی کارخانے، کان اور دیگر خطرناک مقامات پر ملازمت پر سختی سے پابندی عائد کرتا ہے۔ بچوں کی ملازمت کے بارے میں قومی قانون خطرناک مقامات پر کام کے لیے کم سے کم عمر ۱۵ سال مقرر کرتا ہے، حالانکہ یہ عمر بھی بین الاقوامی معیار پر پورا نہیں اُترتی۔ قومی قانون ملازمت کے لیے کم سے کم عمر ۱۵ سال مقرر کرتا ہے، بہر حال اس قانونی عمر کا اطلاق غیر رسمی شعبوں پر نہیں ہوتا۔ ۱۴ سال سے بڑے بچوں کے لیے قانون بچے کے اوقات کار سات گھنٹے مقرر کرتا ہے، جس میں ہر تین گھنٹے کی محنت کے بعد ایک گھنٹہ آرام بھی شامل ہے، جبکہ یہ قانون کام کے لیے وقت تعین اور چھٹی کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ قانون بچوں کے اوور ٹائم یا رات کے وقت کام کرنے سے ممانعت کرتا ہے اور یہ بھی صادر کرتا ہے کہ ان کو ہفتے میں ایک چھٹی ملنی چاہئے۔ اس کے ساتھ قانون آجروں کو پابند کرتا ہے کہ وہ لیبر انسپکٹر کی جانب سے تصدیق کو یقینی بنانے کے لیے کمسن مزدوروں کے اندراج کا رجسٹر ساتھ رکھیں۔ یہ پابندیاں اور قواعد وضوابط گھریلو کاروبار پر لاگو نہیں ہوتا۔

۲۶ جنوری کو، صوبہ سندھ نے بچوں کی ملازمت کی ممانعت کا بل منظور کیا، جو ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کی ملازمت پر پابندی عائد کرتا ہے اور خطرناک کام کے لیے کم از کم عمر ۱۹ سال مقرر کرتا ہے۔ یہ قانون خلاف ورزی کرنے والوں کو ۶ مہینے قید اور ۵۰،۰۰۰ روپیہ (۴۵۰ ڈالر) جرمانہ، یا کام کرنے کا مقام خطرناک ہونے کی صورت میں تین سال قید اور ایک لاکھ روپیہ (۹۵۰ ڈالر) جرمانہ عائد کرتا ہے۔ دیگر صوبوں نے بھی مذکورہ سال کے دوران بچوں سے مشقت اور بچوں کے تحفظ سے متعلق قانون پاس کیے اور چاروں صوبوں نے چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے وسائل بھی مختص کیے۔

وفاقی قانون ۱۸ سال سے کم عمر بچوں کے استحصال کی ممانعت کرتا ہے، اور جسمانی کھیل، جنسی حرکات اور دوسری بدسلوکی والی سرگرمیوں کو استحصالی تفریح قرار دیتا ہے۔ بچوں کا استحصال کرنے والے والدین قانون کو جوابدہ ہیں۔ بچوں کو بانڈیڈ لیبر بنانے پر قانون پانچ سال قید اور پچاس ہزار روپے (۴۵۰ ڈالر) جرمانہ تجویز کرتا ہے۔ حکومت نے ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کی خطرناک کام میں ملازمت پر پابندی عائد کی ہے، جس میں چار پیشے اور ۳۴ صورتیں شامل تھیں جیسا کہ گلیوں میں پھیری لگانا، سرجیکل آلات سازی، گہرے سمندر میں ماہی گیری، چمڑہ سازی، اینٹ سازی، فٹبال کی پیداوار اور قالین کی بُنائی۔ پابندیوں کے باوجود ان سب شعبوں میں بچوں کے کام کرنے کی اطلاعات تھیں۔

بچوں سے مشقت کے مسائل کے خلاف وفاقی سطح کی کارروائیاں بے اثر رہیں۔ اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے نتیجہ میں مزدوروں کا معائنہ وفاق کی بجائے صوبائی سطح پر کیا گیا، جس کے باعث لیبر قانون کے غیر متوازن استعمال میں اضافہ ہوا۔ قانون نافذ کرنے کی طاقت مسئلہ کے حجم کے مقابلے میں کم رہی۔ انسپکٹروں کے پاس تربیت اور وسائل کی کمی تھی اور ان پر بدعنوانی میں ملوث ہونے کا شک کیا جاسکتا تھا۔ اختیارات کی صوبوں کو منتقلی کے بعد

لیبر انسپیکشن بہت کم واقع ہونے لگیں اور کم از کم ا انسپیکشن کو دہرانے کا کوئی شرطیہ معیار لاگو نہیں تھا۔ حکام نے این جی اوز کو آزادانہ طور پر معائنہ کرنے کی اجازت دی اور اسپارک کے مطابق حکام نے عام طور پر اس کے معائنہ کے دورے میں تعاون کیا۔

حکام نے زیادہ تر تو قانون کی خلاف ورزیاں کرنے والوں پر سزائیں لاگو نہیں کیں، اگر کیں بھی تو بہت حقیر۔ مثال کے طور پر بچوں سے مشقت کے قانون کی خلاف ورزی پر سینکڑوں سزائیں سنائی گئیں لیکن قانون کی پامالی کے مرتکب افراد پر لاگو کیا گیا جرمانہ اتنا زیادہ نہیں جس سے مستقبل میں ایسی خلاف ورزیوں کی روک تھام ہو سکے۔

بچوں سے مشقت کے قوانین کے نفاذ میں حکومتی کوتاہی کے باعث بچوں سے مشقت لینے کا عمل جاری رہا اور بہت سے بچے زراعت اور گھریلو ملازمت سے وابستہ رہے۔

زراعت کے شعبہ کے علاوہ، بچوں سے مشقت لینے کا ۷۰ فیصد عمل چھوٹی ورکشاپوں میں واقع ہوا، جس کے باعث انسداد چائلڈ لیبر قوانین نافذ کرنے میں دشواریاں پیش آئیں، کیونکہ قانون انسپیکٹرز کو کسی ایسے مقام پر چھاپہ مارنے کی اجازت نہیں دیتا جہاں پر دس سے کم افراد ملازمت کر رہے ہوں۔

آجروں اور خاندان والوں نے بچوں کو مجبور کیا کہ وہ اینٹوں، چوڑیوں، قالین، اور زراعت کے شعبہ میں کام کر کے بھٹہ مالکان اور زمینداروں کا قرض چکانے میں خاندان کا ہاتھ بٹائیں۔ ۲۰۱۲ء میں محققوں کی جانب سے لگائے گئے اندازوں کے مطابق ملک میں ۲۰ لاکھ افراد جبری مشقت کا شکار تھے، جن میں سے اکثر بچوں کے ساتھ پورے خاندان شامل تھے۔ اطلاعات کے مطابق بچوں نے عطریات، کپاس، گندم، کپڑے، تمباکو، گنّے اور جواہرات کی پیداوار، اور پتھر توڑنے کے مقامات پر کام کیا۔

غریب دیہاتی خاندانوں نے بعض اوقات اپنے بچوں کو گھریلو ملازمت یا دیگر اقسام کے کام کے لیے فروخت کیا یا ایجنٹوں کو ایسے کسی کام کا انتظام کرنے کے لیے معاوضہ دیا، ان کا خیال تھا کہ ان کے بچے اچھے ماحول میں کام کریں گے۔ تعلیم فراہم کرنے یا دیگر مراعات کے بدلے رشتہ داروں یا جاننے والوں کے ہاں کام کرنے کے لیے بھیجے گئے بچے بھی استحصالی حالات اور جبری مشقت کا شکار ہوئے۔
منظم بھکاری ٹولوں، گھریلو ملازمت، عسکری اور جرائم پیشہ ٹولوں، اور جنسی فحاشی کی غرض سے اسمگلنگ کے جرائم میں استعمال ہونے کے لیے بچوں کے اغوا یا خرید و فروخت کے واقعات رُونما ہوئے۔
محکمہ لیبر کی بچوں کی جبری مشقت سے متعلق رپورٹ مندرجہ ذیل لنک پر ملاحظہ کیجیے:
www.dol.gov/ilab/reports/child-labor/findings/

(د)۔ ملازمت اور پیشہ کے حوالہ سے امتیازی سلوک

حالانکہ قوائد وضوابط ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں میں نسل، جنس، صنف، معذوری، زبان، صنفی شناخت، ایچ آئی وی یا دیگر وبائی بیماری یا سماجی حیثیت کی بنیاد پر امتیازی سلوک کرنے سے روکتے ہیں مگر حکومت نے ان قوانین کو مؤثر انداز میں نافذ نہیں کیا۔

مذکورہ حقائق کی بنیاد پر ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں تفریق چھائی رہی۔ اس قانون کی خلاف ورزیوں کے رد عمل میں مجوزہ سزائیں مستقبل میں ایسی پامالی کے امکانات کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ناکافی تھیں۔

(ہ)۔ کام کرنے کے قابل قبول حالات

۲۰۱۰ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد وفاقی وزارت برائے محنت اور افرادی قوت تحلیل کر کے محنت کشوں کے امور صوبوں کے حوالے کیے گئے۔ مزدوروں کی نمائندہ تنظیموں، بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز نے انتقال اختیار پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ کم از کم اجرت، مزدوروں کے حقوق، قومی لیبر معیار اور بین الاقوامی لیبر قوانین پر عملدرآمد کی نگرانی سمیت محنت کشوں کے امور وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار میں رہنے چاہئیں۔ مبصرین نے صوبوں کی صلاحیتوں اور عزم پر بھی تحفظات کا اظہار کیا کہ وہ کیسے لیبر قوانین کو اپنا کر عملدرآمد کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، کچھ بین الاقوامی تنظیموں نے یہ بھی کہا کہ اختیارات کی منتقلی سے صوبائی اداروں کو احساس ذمہ داری حاصل ہوا جس کے باعث معائنہ سمیت مزدور دوست اقدامات کی اطلاعات بھی سننے میں آئیں۔

جولائی ۲۰۱۶ء میں حکومت نے غیر ہنر مند مزدوروں کی تنخواہ ۱۳،۰۰۰ روپیہ (۱۱۸ ڈالر) سے بڑھا کر ۱۴،۰۰۰ روپے (۱۲۷ ڈالر) ماہوار کر دی اور سب صوبائی حکومتوں کے بجٹ میں بھی اس حکم نامے پر عملدرآمد ہونا تھا۔ سرکار اگر سالانہ بجٹ میں کم از کم اجرت میں اضافہ کرتی ہے تو وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ایسے اضافے کو لاگو کرنے کے لیے نوٹیفکیشن جاری کریں۔ کم از کم اجرت کے قانون کا نفاذ محنت کشوں کے اہم شعبوں، بشمول غیر روایتی شعبے، گھریلو ملازمین اور شعبہ زراعت سے وابستہ مزدوروں پر نہیں ہوتا۔

قانون زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹہ فی ہفتہ (موسمی کارخانوں کے لیے ۵۴ گھنٹے) کام کرنے کی حد کا تعین کرتا ہے۔ جس میں کام کے دوران آرام کا وقفہ اور تنخواہ کے ساتھ سالانہ چھٹیاں شامل ہیں۔ لیبر کوڈ کے تحت اضافی مراعات میں سرکاری چھٹیاں، اوور ٹائم، سالانہ اور بیماری کی صورت میں چھٹی، صحت کی دیکھ بھال، مزدوروں کے بچوں کے لیے تعلیم، سوشل سیکیورٹی، اولڈ ایج مراعات اور ورکرز ویلفیئر فنڈ کی مراعات شامل ہیں۔ لیکن بہت سے

فیکٹری ملازمین کانٹریکٹ لیبر کے طور پر بھرتی کیے گئے تھے، جن کو بنیادی اجرت کے سوا کوئی بھی مراعات یا ملازمت کا تحفظ حاصل نہیں تھا اگرچہ وہ کئی سالوں سے بھی ایک ہی آجر کے پاس کام کرتے چلے آرہے ہوں۔

یہ قوانین شعبہ زراعت کے محنت کشوں، دس سے کم ملازمین والے کارخانوں، گھریلو ملازمین اور ٹھیکیداروں پر لاگو نہیں ہوتے۔ ان اقسام کی ملازمتوں سے وابستہ ملازموں کو تکالیف کے ازالے کے لیے لیبر عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق بھی نہیں اور ان کو استحصال کا شکار ہونے کے شدید خطرات کا سامنا رہا۔ بیشمار قوانین کی غیر فعالیت اور حکومت کی جانب سے نفاذ میں کوتاہی نے بہت سے شعبوں میں آجروں کو کام کے ماحول، ملازمین سے برتاؤ، کام کے اوقات اور تنخواہ کے معاملات میں جوابدہی سے نسبتاً بریت دیئے رکھی۔

محنت کشوں سے متعلق قومی قوانین کو نافذ کرنا صوبائی حکومتوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ محدود وسائل، بدعنوانی اور نامناسب انتظامی بندوبست کی وجہ سے قوانین کا نفاذ غیر مؤثر تھا۔ پنجاب میں ایک سسٹم نے جس کے تحت مالکان کی جانب سے رضاکارانہ طور پر اپنی فیکٹریوں کے اندر حفاظتی انتظامات، صحت اور تنخواہوں کے بارے میں قواعد وضوابط کا اعلامیہ مشتہر کیا، معمول کے سرکاری معائنوں کی جگہ لے لی۔ اس کے بعد حکام بے قاعدگی سے کارخانوں کو معائنہ کے لیے منتخب کرتے تھے۔ بلوچستان اور کے پی میں اچانک معائنوں کی اجازت دی گئی۔ بیشمار مزدور، خصوصی طور پر غیر رسمی شعبہ کے کارکن، اپنے حقوق سے لاعلم تھے۔ لیبر انسپیکشن پر سخت پابندیوں اور وسائل کی کمی اور بدعنوانی کی بدولت انسپیکشن اور سزائیں لیبر قوانین کی خلاف ورزیوں کو ختم کرنے کے لیے ناکافی تھیں۔

صحت اور حفاظت کے معیار سارے شعبوں میں خراب تھے۔ کان کنی کی صنعت میں حفاظت اور صحت کے اصولوں کی پاسداری میں سخت کوتاہی تھی۔ بہت ساری کانوں میں داخلہ، اخراج اور ہوا خوری کا ایک ہی سوراخ تھا۔ کام کرنے کے خطرناک ماحول سے جان چھڑانے کے لیے مزدوروں کے پاس روزگار گنوانے کا خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ غیر روایتی شعبہ کے کارکنوں کو نازک صورتحال کا سامنا تھا، خاص طور پر پوشیدہ جگہوں جیسے گھریلو ملازمت میں۔ مذکورہ سال کے دوران مقام ملازمت پر اموات اور حادثات کے حوالہ سے سرکاری اعداد وشمار موجود نہیں تھے۔ مل منتظمین اکثر آتشزدگی یا دیگر حادثہ کے متاثرہ فرد کی شناخت کی تصدیق سے قاصر تھے کیوں کہ ان افراد کا کنٹریکٹ ملازمین ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔

نومبر ۲۰۱۶ء میں سندھ کے علاقہ گڈانی کے شپ بریکنگ مرکز میں دھماکوں اور آتشزدگی سے اندازً ۲۰ افراد ہلاک اور ۵۰ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ۲۰۱۶ء سے اگست ۲۰۱۷ء تک گڈانی شپ بریکنگ یونٹ میں کم از کم سات افراد ناقص حفاظتی انتظامات کی وجہ سے موت کا شکار ہوئے۔ ستمبر ۲۳ کو کراچی میں ایک مل کی کیمیائی ٹینکی میں گر کر تین مزدور ہلاک جبکہ چوتھا زخمی ہوا تھا۔ بلوچستان میں ستمبر میں مختلف حادثات میں کوئلے کی کان میں کام

کرنے والے آٹھ کارکن ہلاک ہوئے جبکہ مزدور رہنماؤں نے بتایا کہ صوبہ میں کوئلہ کانوں کے ۸۰ مزدور سال کے دوران ناقص حفاظتی انتظامات کے باعث ہلاک ہوئے۔

صحت وصفائی کے عالمی معیار پر پورا اترنے میں ناکامی نے ملک کی بیرون ملک درآمد کے لیے قابل بھروسہ ملک ہونے کے حوالے سے شکوک وشبہات کو جنم دیا۔ تاہم ۱۸ نومبر کو حکومت سندھ نے آئی ایل او کی مشاورت سے تیار کیا گیا جامع پیشہ ورانہ صحت اور حفاظت کا قانون نافذ کیا۔

۲۰۱۲ء میں کراچی کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں آتشزدگی کے باعث ۲۵۹ لوگوں کی اموات کے بعد مزدوروں کے حقوق کے لئے آواز اٹھانے والے بہت سے افراد نے شکایت کی کہ کئی ایک خاندانوں کو طے شدہ معاوضہ نہیں ملا۔ ستمبر ۲۰۱۶ء میں آئی ایل او نے فیکٹری مالک اور ٹریڈ یونین نمائندگان سے مل کر متاثرین کے لیے معاوضہ کا بندوبست کیا، جس میں آتشزدگی سے متاثرہ خاندانوں کی طویل المیعاد مالی امداد کی خاطر پانچ اعشاریہ پندرہ ملین ڈالر شامل تھے۔ مزدور نمائندوں نے کہا کہ موجودہ قوانین پر ناقص عملدرآمد کے باعث، حادثہ کا سبب بننے والے بہت سارے عوامل—سب سے قابل ذکر جعلی سیفٹی سرٹیفکیٹ اور آتشزدگی سے بچاؤ کے نامناب انتظامات—اب بھی دیگر بہت ساری کمپنیوں میں موجود ہیں۔

####